

قرآن و سنت اور اسلاف امت کی تعلیمات کا داعی
دینی، علمی، ادبی، تحقیقی اور اصلاحی مضامین کا حامل

مجلہ صدائے حق بنگلور



سرپرست

حضرت محمد سلمان صاحب بجنوری معالجیم
مولانا زیدت
استاذ حدیث و مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

نائب مدیر

مفتی عبدالرحمن بنگلوری

مدیر

عبدالرزاق بنگلوری

ناشر

مجلس، صدائے حق اسلامک پورٹل بنگلور-78

قرآن و سنت اور اسلاف امت کی تعلیمات کا داعی
دینی، علمی، ادبی، تحقیقی اور اصلاحی مضامین کا حامل
مجلد

صدائے حق بنگلور

جلد: ۰۴ شماره: ۹ ماہ مارچ ۲۰۲۳ء ماہ رمضان ۱۴۴۵ھ

سرپرست

حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری دامت برکاتہم
استاذ حدیث و مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

ADVERTISEMENT TARIFF

Full Page (Title Back Cover) 6000/-

Full Page (Title Inner Cover) 5000/-

Black and White

Full Page (Inside Pages) 2000/-

Half Page (Inside Pages) 1000/-

Quarter Page (Inside Pages) 500/-

Phone Pe & Google Pay: 7406464533

مضمون نگاری کی آرا سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

شائع کردہ

مجلس: صدائے حق اسلامک پورٹل بنگلور 78

نائب مدیر

مفتی عبدالرحمن صاحب بنگلوری

مدیر

عبدالرزاق بنگلوری

مجلس ادارت

مفتی محمد علی صاحب قاسمی

مولانا محمد اویس صاحب رشادی

مولانا عبداللطیف صاحب قاسمی

مجلس مشاورت

مولانا اشرف صاحب قاسمی

مولانا عبدالقدوس صاحب مظاہری

مفتی عبدالفتاح صاحب قاسمی

فہرست

صفحہ نمبر	اسمائے محررین	مضامین	عناوین
۳	مفتی عبدالرزاق بنگلوری	ماہ رمضان اور اُس کے فیوض و برکات	اداریہ
۷	مفتی عبدالرحمن صاحب بنگلوری	رمضان کے روزوں کا ثواب بے انتہا ہے	درس حدیث
۱۲	مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی	توبہ کی اہمیت اور اُس کا طریقہ	اصلاح معاشرہ
۱۷	مفتی محمد عصفان صاحب منصور پوری	تیہوں کا خیال رکھنا	// // //
۲۳	مفتی محمد سلطان خان صاحب قاسمی	قلب کو اخلاق محمودہ سے مزین کرنے کا بیان (قسط ۱۱)	// // //
۳۰	مولوی محمد عمر فاروق سلمہ فتح پوری	استقبالِ رمضان	// // //
۳۲	مفتی احمد اللہ نثار صاحب قاسمی	طلبہ کرام کے ساتھ نرمی کریں	// // //
۴۱	مفتی عبداللطیف صاحب قاسمی	امام المغازی ابو عبد اللہ محمد بن عمرو اقدی اور اُن کی سخاوت	// // //

اطلاع عام

نوٹ: مضمون نگار اپنے مضامین مندرجہ ذیل ای میل (E-mail) یا واٹس ایپ (WhatsApp) پر ان پیج

(InPage) فائل روانہ کر سکتے ہیں، جزاکم اللہ خیراً وأحسن الجزاء.

Email: muftiabdurrahman57@gmail.com

Whatsapp No: 09620795460 - 9739349433

ماہِ رمضان اور اُس کے فیوض و برکات

از: مفتی عبدالرزاق بنگلوری

اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے رمضان المبارک ایک بہترین مہینہ ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کا خصوصی نزول ہوتا ہے، بندوں کو اپنا محبوب بنانے اور ان کی مغفرت کرنے کے لیے اس مہینے میں اللہ تعالیٰ نے نہایت ہی مبارک اعمال رکھے ہیں، اور ہر عمل کا ثواب بھی اپنی اصل سے دوگنا بڑھا دیا گیا ہے؛ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص رمضان کے مبارک مہینے میں کسی نیکی کیساتھ اللہ کا قرب حاصل کرے گا، اس کا حال ایسا ہے جیسا کہ رمضان کے علاوہ کسی اور مہینے میں کوئی فرض ادا کیا ہو، اور جو شخص اس ماہ مبارک میں کوئی فرض عبادت ادا کرے گا اُس کا حال ایسا ہے جیسا کہ غیر رمضان میں ستر فرض ادا کیا ہو۔ (شعب الایمان: ۳۰۵/۳) اس مبارک مہینے کی قدر و منزلت آج امت مسلمہ کے نزدیک بڑی بلند پایہ حیثیت رکھتی ہے، اور بعض وہ لوگ بھی ہیں، جو ہلکے سے لچر عذر کی وجہ سے روزہ چھوڑ دیتے ہیں؛ حالانکہ حدیث میں روزے کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ”وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَخُلُوفُ فَمِ الصَّائِمِ أَطْيَبُ عِنْدَ اللَّهِ مِنْ رِيحِ الْمَسْكِ يَتْرُكُ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ وَشَهْوَتَهُ مِنْ أَجْلِي، الصَّيَّامُ لِي وَأَنَا أَجْزِي بِهِ“ (بخاری شریف: ۲۵۴۱) روزے دار کے منہ سے بھوک کی وجہ سے جو بو آتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک سے بھی بڑھ کر ہے؛ کیوں کہ روزے دار صرف اللہ کی رضا کی خاطر کھانے پینے اور اپنی خواہش پوری کرنے سے اجتناب کرتا رہا، یہ سارے روزے اُس نے میرے لیے رکھے ہیں اور میں خود اس کا بدلہ عطا کروں گا۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ آج لوگ معمولی بہانے سے روزہ جیسی عظیم الشان عبادت کو ترک کر دیتے ہیں بطور خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: روزہ اور قرآن دونوں ایک ساتھ قرآن پڑھنے والے روزے دار کے لیے اللہ کے دربار میں شفاعت کریں گے اور اللہ تعالیٰ سے روزہ اس طرح فریاد کرے گا کہ میں نے اس کو کھانے پینے اور شہوت پوری کرنے سے دن کے وقت میں روک رکھا؛ لہذا میری شفاعت روزے دار کے حق میں قبول فرمائے، اور قرآن کریم کہے گا کہ میں نے راتوں کو اس کو سونے اور آرام کرنے سے روکے

رکھا، میری شفاعت قرآن خواں کے حق میں قبول فرمائیے؛ چناں چہ اللہ تعالیٰ روزہ اور قرآن دونوں کی شفاعت اپنے بندے کے حق میں قبول فرمائیں گے۔ (مسند احمد: ۱۷۴۲، رقم: ۶۶۲۶) اللہ تعالیٰ کی عظمت شان کبریائی کا کسی کو کیا اندازہ کہ اپنے بندوں کی مغفرت اور کفارہ ذنوب کے متلاشی رمضان کا مقدس مہینہ عطا کیا، اور یہ بابرکت مہینہ امت محمدیہ کی خصوصیات میں سے ہے، کہ پچھلی امتوں پر روزے فرض تھے؛ مگر کہیں ایسی مبارک گھڑیوں کا تذکرہ نہیں ملتا۔

تراویح کی فضیلت:

اس مقدس مہینہ میں تراویح کے ذریعے عبادت کا ذائقہ کچھ اور ہی محسوس ہوتا ہے؛ چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”فَمَنْ صَامَهُ وَقَامَهُ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا خَرَجَ مِنْ ذُنُوبِهِ كَيَوْمٍ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ“۔ (ابن ماجہ: ص ۹۴، رقم: ۱۳۲۸) جو شخص ایمان کی حالت میں اللہ سے ثواب کی امید رکھتے ہوئے اس مہینے کا روزہ رکھے گا اور اس کی راتوں میں (تراویح کی نماز کے لیے) قیام اللیل کرے گا وہ اپنے گناہوں سے اس طرح نکل کر پاک ہو جائے گا، جس طرح وہ اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے وقت گناہوں سے پاک تھا، بالخصوص تراویح حفاظ کے لیے اللہ کی جانب سے بہت بڑا انعام اور احسان ہے، اگر تراویح کی نماز نہ ہوتی تو یہ کہنے میں کوئی بعید نہیں کہ چند گنے چنے حفاظ باقی رہ جاتے، جن کو قرآن کریم یاد ہوتا، بس اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ نے تراویح کو ایک الگ سنت قرار دیا ہے اور اس میں مکمل قرآن مجید پڑھنے کو الگ سنت قرار دیا ہے، تو جب دونوں کا وجود اس مبارک مہینے میں ہوتا ہے، تو پھر حدیث کا جملہ ”خَرَجَ مِنْ ذُنُوبِهِ كَيَوْمٍ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ“ کا مصداق ضرور ہوں گے۔

اعتکاف کی فضیلت:

رمضان المبارک کے آخری عشرہ کا اعتکاف سنتِ مؤکدہ ہے، یعنی تمام محلے میں سے کسی نہ کسی آدمی کا اعتکاف کرنا ضروری ہے، اگر کوئی بھی اعتکاف میں نہ بیٹھے تو تمام محلے والے گنہگار ہوں گے اور آخری عشرہ کا اعتکاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر کیا ہے، اور اس کے بڑے فضائل بھی احادیث مبارکہ میں موجود ہیں، ایک روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے: ”مَنْ اعْتَكَفَ عَشْرًا فِي رَمَضَانَ كَانَ لِحَجَّتَيْنِ وَعُمْرَتَيْنِ“۔ (الترغیب والترہیب: ۹۶۲) جو شخص رمضان المبارک کے مہینے میں عشرہ آخری کا اعتکاف کرے گا اُس کو اللہ کی جانب سے دو حج اور دو عمرے کا ثواب ملے گا۔

آہ! صدیوں سے جس کا انتظار تھا
کیا پتہ کہ گھر بیٹھے حصولِ ثواب ممکن تھا
مگر رمانِ رسول کہ عشرہٴ اخیر کا
اعتکاف، دو حج و عمرہ کا ثواب ہے

ایک اور دوسری روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جو شخص رضائے الہی اور مرضیٰ موملی حاصل کرنے کے لیے ایک دن کا اعتکاف کرتا ہے تو اُس کے اور جہنم کے درمیان ایسی تین خندقیں حائل کر دے گا کہ اُن میں سے ہر ایک خندق کا فاصلہ اتنا ہوگا جتنا آسمان اور زمین کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے۔

(الترغیب والترہیب: ۹۶/۲)

مگر افسوس ہے کہ ہمارے نوجوانوں کا آخری عشرہ تو عید کی تیاری کے لیے بازاروں میں گزرتا ہے، اور عورتیں بے پردگی سے حیا کی تمام حدود کو پھیلا کر بازاروں کی زینت بننے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتیں؛ حالانکہ رسول ربِّ کریم نے فرمایا کہ: ”أَوَّلُ شَهْرٍ رَمَضَانَ رَحْمَةً وَأَوْسَطُهُ مَغْفِرَةٌ وَآخِرُهُ عِتْقٌ مِنَ النَّارِ“ (جامع الاحادیث: ۲۹۸/۳) رمضان کا پہلا عشرہ رحمت ہے اور اس کا درمیانی عشرہ مغفرت کا ذریعہ ہے اور اس کا آخری عشرہ جہنم سے خلاصی کا ذریعہ ہے، اب ہم خود فیصلہ کریں کہ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں بے پردگی اور بے حیائی کا مظاہرہ ہماری مسلمان خواتین کرتی ہیں، ہم نے تو پہلے عشرہ میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کو حاصل کر لیا، اور دوسرے عشرہ میں مغفرت کروالی، پھر جب آخری عشرہ میں آگ سے خلاصی کا موقع ملا تو بے حیائی (وہی بے ڈھنگی رفتار جو پہلے تھی سواب بھی ہے) کا شکار ہو گئے۔

لیلة القدر:

شبِ قدر رمضان المبارک کی راتوں میں سے ایک رات ہے، جو ماہ مبارک کے آخری عشرہ میں لاعلیٰ التعین کوئی رات ہے، جو بہت ہی خیر و برکت کی رات ہے، قرآن وحدیث کے اندر اس رات کی عبادت کو ہزار مہینے کی عبادت سے بھی بہتر اور افضل بتلایا گیا ہے، اور ایک ہزار مہینے تراسی (۸۳) سال، ۴ مہینے ہوتے ہیں، اگر کوئی خوش قسمت اُس رات میں عبادت کرتا ہے تو اس کو تراسی سال چار مہینے تک عبادت کرنے سے بھی زیادہ ثواب اور فضیلت حاصل ہوگی، لیلة القدر میں اگر کسی کو عبادت کی توفیق مل گئی تو انتہائی خوش نصیب آدمی ہوگا اور اس رات میں عبادت کی وجہ سے پچھلے تمام گناہوں سے پاک و صاف ہو جاتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”مَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ“۔ (ترمذی شریف: ۱۴۷/۱)

جو شخص ایمان کی حالت میں ثواب کی امید رکھتے ہوئے لیلۃ القدر میں عبادت کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے، تو اس کے ماقبل کے سارے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔

حرفِ آخر:

انسان اگر اپنی مغفرت اللہ کے دربار میں کروانا چاہتا ہے تو اُس کے لیے بہت سے مواقع اللہ نے دیے ہیں؛ مگر ہمیں خبر نہیں ہے، ہم دنیاوی مشاغل میں ایسے گھرے رہتے ہیں کہ ہمیں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کیا آرہا ہے اور کیا جا رہا ہے؟ ہاں! اگر پتہ چل بھی جائے تو عبادت میں سستی اور کاہلی ایک لابدی امر بن جاتی ہے، رمضان کے آخری عشرہ میں عید کی تیاریوں میں لگ کر بجائے مسجدوں کو آباد کرنے کے بازاروں کو آباد کرنا ہمارا مشغلہ بن چکا ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ رمضان المبارک کی صحیح قدر دانی کر کے اس میں خوب اللہ کو راضی کرنے کی توفیق عطا فرمائے، برس کے گیارہ مہینے تو ہم نے اللہ کو ناراض کیا؛ مگر ایک مہینہ ایسا گزارے کہ ایک لمحے کے لیے بھی اللہ ہم سے ناراض نہ ہو۔ (آمین)



رمضان کے روزوں کا ثواب بے انتہا ہے

از قلم: مفتی عبدالرحمن صاحب بنگلوری، ناظم مدرسہ دارالتوحید، اعلیٰ ہلی بنگلور

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی کے ہر نیک عمل کا ثواب بڑھایا جاتا ہے اس طرح کہ ایک نیکی برابر دس ویسی ہی کے، پھر اُس سے لے کر سات سو گئے تک۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مگر روزہ، سو وہ خاص میرے ہی لیے ہے اور میں ہی اُس کا صلہ دوں گا (یعنی روزے کا اجر وصلہ جتنا گونا گوں اور افزوں ہے اُس کو میں ہی جانتا ہوں اور جس طرح اور جتنا زیادہ چاہوں گا خود دوں گا، کسی خاص قانون و ضابطہ کے حوالے اس کو نہیں کروں گا) کیوں کہ وہ (میرا روزہ دار بندہ) خالص میرے (حکم کی پیروی میں اور میری رضا

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ كُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ يُضَاعَفُ الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا إِلَّا إِلَى سَبْعِ مِائَةٍ ضَعْفٍ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى إِلَّا الصَّوْمَ فَإِنَّهُ لِي وَأَنَا أَجْزِي بِهِ يَدْعُ شَهْوَتَهُ وَطَعَامَهُ مِنْ أَجْلِي لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهِ وَفَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ رَبِّهِ وَلَخَلُوفٌ فِيهِ الصَّائِمِ أَطْيَبُ عِنْدَ اللَّهِ مِنْ رِيحِ الْمَسْكِ وَالصَّيَامُ جَنَّةٌ فَإِذَا كَانَ يَوْمٌ صَوْمٍ أَحَدِكُمْ فَلَا يَرْفُثْ وَلَا يَصْخَبْ فَإِنْ سَابَهُ أَحَدٌ أَوْ قَاتَلَهُ فَلْيَقُلْ إِنِّي صَائِمٌ.

(بخاری: ج ۱، ص ۲۵۵، رقم: ۱۸۶۵)

و خوشنودی اور میرے ثواب کے) لیے اپنی خواہش نفس اور اپنا کھانا پینا چھوڑتا ہے پھر روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں، ایک خوشی اُس کے افطار کے وقت، اور ایک خوشی اپنے پروردگار سے (ثواب) ملنے کے وقت۔ اور بالیقین روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ اچھی ہے۔ اور روزہ سپر (ڈھال) ہے (یعنی روزہ کے سبب سے بندہ دنیا میں تو شیطان کے شر اور حملوں سے اور آخرت میں دوزخ کی آگ سے بچتا ہے)۔ پس جب تم میں سے کسی کا روزہ کا دن ہو (یعنی جو روزہ دار ہو) تو وہ نہ بیہودہ اور فحش باتیں بکے اور نہ (بیہودگی کے ساتھ) چلائے اور شور کرے۔ اور اگر کوئی دوسرا اُس سے گالی گفتار کرے یا اُس سے لڑنا جھگڑنا چاہے تو وہ کہہ دے کہ میں روزہ دار شخص ہوں۔

تشریح:

”ایک نیکی برابر دس ویسی ہی کے“۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو جن خصوصی عنایات و مراعات سے نوازا ہے اُن میں سے ایک یہ ہے کہ مسلمان بندہ جو بھی نیک عمل کرتا ہے تو اُس کا ثواب اُس کو اسی ایک عمل کے بقدر نہیں؛ بلکہ ویسے ہی دس عمل کے برابر ملتا ہے، یا یوں کہیے کہ اُس ایک عمل کا ثواب دس گنا بڑھا کر اُس کو دیا جاتا ہے۔

”پھر اُس سے لے کر سات سو گئے تک“۔ یعنی ایک نیک عمل (ایک نیکی) پر دس گنا (بڑھا ہوا ثواب ملنا کم سے کم درجہ ہے، یہ (دس گنا) ہر نیک عمل کا بنیادی اجر و انعام ہے جو ضرور ہی عطا ہوگا۔ پھر جس نیک عمل میں نیت کے صدق و اخلاص کی کیفیت جس درجہ بڑھی ہوئی ہوگی اُسی درجہ تک اُس عمل کا ثواب اس (دس گنا) سے بھی زیادہ بڑھا ہوا عطا کیا جائے گا، یہاں تک کہ جس نیک عمل میں (صدق و اخلاص کی) یہ کیفیت بہت بڑھی ہوئی ہوگی اُس کا ثواب سات سو گنا بڑھا کر دیا جائے گا؛ بلکہ مخصوص فضیلت کے حامل بعض مقامات وہ ہیں جہاں کیے جانے والے نیک اعمال کا ثواب اس (سات سو گئے) سے بھی کہیں زیادہ بڑھا ہوا ملنے کی بشارت دی گئی ہے، جیسا کہ مکہ مکرمہ کے بارے میں آیا ہے کہ وہاں ایک نیکی کی ایک لاکھ نیکیاں لکھی جاتی ہیں (یعنی ایک کا ثواب ایک لاکھ گنا بڑھا کر دیا جاتا ہے)۔

”مگر روزہ“..... یعنی اس امت کے حق میں اللہ تعالیٰ کا جو خاص قانونِ رحمت ہے (کہ ایک نیکی پر دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ثواب دیا جاتا ہے) روزہ اُس سے مستثنیٰ و ماوراء ہے، اس (روزے) کا ثواب کتنی بڑھی ہوئی مقدار میں ملتا ہے اس کی انتہا سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا، گویا بندوں کے علم کے اعتبار سے روزہ کا ثواب بے انتہا ہے، اس کی بڑھی ہوئی مقدار کو کوئی نہیں بتا سکتا۔

واضح رہے کہ روزے کی ایسی فضیلت دو وجہ سے ہے: ایک تو یہ کہ دوسری عبادتوں کے برعکس روزہ ہی ایسی عبادت ہے جو لوگوں کی نظر سے پوری طرح پوشیدہ ہوتا ہے، اس کو یا تو روزہ دار ہی جانتا ہے یا اللہ تعالیٰ؛ اس لیے روزہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے حصول کی نیت پر مبنی ہوتا ہے، نہ اس میں ریا و سمعہ (دکھانے اور سنانے) کو دخل ہوتا ہے نہ نفس کو کوئی لذت و راحت ملتی ہے؛ چنانچہ ”فَسَائِنَهُ لِي“ (روزہ خاص میرے ہی لیے ہے) میں اس طرف اشارہ فرمایا گیا ہے اور جس کا مطلب یہی ہے کہ دوسری عبادتوں کے برعکس روزہ ظاہری وجود کے اعتبار سے کوئی ہیئت (شکل و صورت) نہیں رکھتا کہ جس کو دوسرے لوگ دیکھ اور جان سکیں اور دوسرے اس وجہ سے کہ روزہ ایسی عبادت ہے جس میں نفس کشی ہے اور بدن کا نقصان ہے؛ نیز بھوک اور پیاس کی حالت

میں صبر کرنا پڑتا ہے، جب کہ مجموعی طور پر یہ حالت و کیفیت دوسری عبادتوں میں نہیں پائی جاتی؛ چنانچہ ”یَسْذُعُ شَهْوَتَهُ“ کے الفاظ میں اسی طرف اشارہ ہے کہ روزہ دار طبیعت کی رغبت و خواہش کی اُن چیزوں کو چھوڑ دیتا ہے جو روزے کی حالت میں ممنوع ہیں۔

بعض حضرات نے یہ بیان کیا ہے کہ (زمانہ جاہلیت کے) عرب لوگ روزہ رکھنے میں کسی کو اللہ کا شریک نہیں کرتے تھے، یعنی وہ لوگ جس طرح سجدہ وغیرہ اوروں کے لیے کرتے تھے ویسے روزہ کسی کا نہیں رکھتے تھے سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ اور یہ بات تحقیق شدہ ہے کہ روزہ دار جو کھانا پینا وغیرہ چھوڑتا ہے تو وہ خاص طرح کی پاکیزگی حاصل کرتا ہے، گویا اس بات میں ایسا خُلق اختیار کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا خلق ہے، یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ کھانے پینے سے پاک ہے اسی طرح روزہ دار بھی دن کے وقت اپنے کھانے پینے سے بچائے رکھتا ہے؛ اسی وجہ سے روزہ کی یہ خصوصیت ہے۔

”ایک خوشی اُس کے افطار کے وقت“۔ یعنی وہ روحانی خوشی جو خدائی حکم و فرمان سے عہدہ برآ ہونے پر محسوس ہوتی ہے۔ یا وہ روحانی خوشی جو تمام عبادت کی نورانیت اور خدائی تائید و توفیق کے سبب سے حاصل ہوتی ہے، یا وہ حسی فرحت و مسرت جو بھوک اور پیاس کی حالت میں کھانے پینے کے سبب سے حاصل ہوتی ہے۔

حدیث کے آخر میں جو ہدایت ہے اُس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی دوسرا (مخالف وغیرہ) اگر روزہ دار کو گالی دے، اُس کو بُرا بھلا کہے، یا اُس سے لڑنے بھڑنے پر آمادہ ہو تو روزہ دار کو چاہیے کہ صبر و تحمل سے کام لے، جواباً اُس سے گالی گفتار نہ کرے، اُس کو بُرا بھلا نہ کہے اور اس کے ساتھ اُلجھے جھگڑے نہیں؛ بلکہ اُس سے یہ کہے کہ میں روزہ دار ہوں۔ اور یہ بات یا تو اُس (مخالف) کو مخاطب کر کے زبان سے کہے؛ تاکہ وہ (مخالف) گالی دینے یا لڑنے جھگڑنے سے باز رہے؛ کیوں کہ روزہ دار جب مخالف کے سامنے یہ کہے گا تو گویا یہ ظاہر کر دے گا کہ روزہ دار ہونے کی وجہ سے میرے لیے تو جائز نہیں کہ تمہارے ساتھ گالی گفتار یا لڑنے بھڑنے میں اُلجھوں، سو تمہارے لیے بھی مناسب نہیں کہ اس وقت میرے ساتھ لڑائی جھگڑا کرو؛ اس لیے کہ جو لڑنا جھگڑنا نہ چاہتا ہو اُس کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرنا مروّت اور انسانیت کے خلاف ہے، یا اس بات کے کہنے سے اُس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں روزے سے ہوں، اور اس بنا پر میں اس وقت اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری میں ہوں؛ لہذا تمہارے لیے مناسب نہیں کہ مجھ سے زبان درازی یا دست درازی کرو۔ اور یہ بات (کہ میں روزہ دار ہوں) خود کو قابو میں رکھنے کے لیے اپنے دل میں کہے، اپنے آپ سے کہے، یعنی خود کو سمجھائے کہ میں روزے سے ہوں، اس حالت میں (جواباً ہی سہی) کسی کو گالی دینا یا کسی سے لڑنا میرے لیے درست نہیں ہے۔

روزہ کی افادیت:

اللہ تعالیٰ نے روزہ میں جو بڑے بڑے فائدے رکھے ہیں ان میں سے دو فائدے سب سے بڑے ہیں: ایک تو یہ کہ روزہ انسان کو ضبطِ نفس (نفس پر قابو رکھنے) کی توانائی عطا کرتا ہے، جس سے قوتِ بہمیہ (برائی کی طرف لے جانے والی طاقت) مغلوب ہوتی ہے اور قوتِ ملکیہ (نیکی کی طرف لے جانے والی طاقت) غالب آتی ہے، اس کی بدولت وہ خاطرِ جمعی حاصل ہوتی ہے جس سے نفسِ امارہ میں سکون اور ٹھہراؤ پیدا ہوتا ہے، اُس کی تیزی جاتی رہتی ہے اور وہ سب اعضاء سست پڑ جاتے ہیں جو ناجائز کاموں اور فضول باتوں کا آلہ کار بنتے ہیں، جیسے: آنکھ، زبان، کان اور شرم گاہ؛ چنانچہ مشہور مقولہ ہے کہ: "إذا جماعت النفس شبعت جمیع الأعضاء وإذا شبعت جماعت کلہا"، یعنی جب نفس بھوکا ہوتا ہے تو اعضاء بھوکے ہو جاتے ہیں (اپنے اپنے مناسب کی طرف راغب ہوتے ہیں) اور یہاں مناسب سے مراد وہ چیز ہے جس کے لیے عضو پیدا ہوا ہے، مثلاً: آنکھ دیکھنے کے لیے پیدا ہوئی ہے، پس نفس (پیٹ) جو بھوکا ہوتا ہے تو آنکھ کسی بُری چیز کی طرف دیکھنے کی مشتاق نہیں ہوتی، پیٹ بھرے پر مشتاق ہوتی ہے، اسی طرح دوسرے اعضاء بھی۔

(۲) دوسرا (سب سے بڑا فائدہ) یہ ہے کہ روزہ کے ذریعے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے، یعنی باطنی کدورتیں زائل ہوتی ہیں اور قلب صاف و شفاف ہو جاتا ہے؛ کیوں کہ انسان کے باطن میں جو کدورتیں پیدا ہوتی ہیں اور ان کدورتوں سے قلب (دل) پر جو غبار آتا ہے ان کا موجب زبان اور آنکھ وغیرہ ظاہری اعضاء کے فضول افعال ہوتے ہیں، یعنی ضرورت و حاجت سے زائد کلام کرنا، بلا ضرورت آنکھ کا ادھر ادھر دیکھنا، اور اسی طرح دوسرے اعضاء کا حاجت سے زیادہ اپنے افعال کا کرنا اور روزہ دار چوں کہ نفس (پیٹ) اور خواہشات کے جائز تقاضوں کو بھی دباتا ہے؛ اس لیے وہ ظاہری اعضاء کے فضول کاموں سے بھی اجتناب کرتا ہے اور ان سے محفوظ اور مامون رہتا ہے، اس کی بدولت اُس کا باطن بے کدورت اور اُس کا قلب باصفا رہتا ہے پھر قلب (دل) کے باصفا رہنے کے سبب سے وہ اچھے کام کرتا ہے اور درجاتِ عالیہ اُس کو حاصل ہوتے ہیں۔ ان دو سب سے بڑے فائدوں کے علاوہ ایک اور اہم فائدہ روزہ کا یہ ہے کہ غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کی طرف رحم و کرم اور بخشش و مہربانی کے ساتھ متوجہ ہونا، جو ایک اعلیٰ درجہ کا انسانی و اخلاقی وصف ہے، اُس کو روزہ کے ذریعے بہت توانائی اور فعالیت حاصل ہوتی ہے؛ کیوں کہ جو انسان خود بھوک کا تعب اٹھاتا ہے اُس کو اس (بھوک) کی کلفت زیادہ تر یاد رہتی ہے؛ چنانچہ وہ جب کسی غریب محتاج اور بھوکے کو دیکھتا ہے تو اس کا جذبہ ترمم بیدار ہو جاتا ہے اور اُس کے ساتھ بخشش و مہربانی کا برتاؤ کرتا ہے۔ اور ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ نادار اور محتاج لوگ جو فقر و افلاس کا دکھ اٹھاتے ہیں کچھ وقت کے لیے

روزہ دار کو ان کی موافقت کرنے اور ان کے ساتھ یکجہتی ظاہر کرنے کا موقع مل جاتا ہے، ظاہر ہے ناداروں اور مسکینوں کی موافقت کرنا بہت بڑی خوبی ہے جس کی وجہ سے اللہ کے نزدیک رتبہ بلند ہوتا ہے۔

منقول ہے کہ ایک عظیم القدر بزرگ حضرت بشر حافی رحمہ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک شخص اُس وقت حاضر ہوا جب کڑا کے کا جاڑا پڑ رہا تھا، اُس نے یہ حیرت ناک منظر دیکھا کہ حضرت موصوفؒ بیٹھے ہوئے جاڑے سے کچکپا رہے ہیں اور اُن کے گرم کپڑے (کمبل وغیرہ) لکڑی کے اسٹینڈ پر لٹکے ہوئے ہیں، اُس شخص نے کہا: حضرت! بھلا ایسے وقت میں آپ نے جاڑے سے بچاؤ کے اپنے کپڑے اپنے اُوپر سے ہٹا کر کیوں رکھ چھوڑے ہیں؟ بزرگ عالی مقام نے فرمایا: میرے بھائی! (جاڑے سے بچانے والے کپڑوں سے محروم) غریب اور مسکین لوگ بہت ہیں، مجھ میں ایسی استطاعت نہیں ہے کہ ان کی مدد اور دست گیری کر سکوں؛ لہذا اُن غریب و مسکین لوگوں کے ساتھ موافقت کرنے کے لیے میں جاڑے کی ویسی تکلیف اٹھا رہا ہوں جیسے وہ لوگ اُٹھاتے ہیں۔ غریبوں اور محتاجوں کے ساتھ یگانگت کا یہی احساس اُن بعض اولیائے کاملین و عارفین کے یہاں پایا جاتا تھا، جن کے بارے میں آیا ہے کہ وہ جب دسترخوان پر بیٹھتے تو ہر نوالہ کھاتے وقت یوں دعا کرتے: ”اللہم لاتؤاخذنی بحق الجائعین“ (اے اللہ! بھوکوں کے حق کے بارے میں مجھ سے مواخذہ نہ کیجیو) حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے کہ اُن کے زمانے میں جب مصر میں سخت قحط پڑا تو باوجودیکہ اُن کے پاس غلہ وافر مقدار میں تھا، وہ پیٹ بھر کھانا اس لیے نہیں کھاتے تھے کہ قحط زدہ بھوکوں کو بھول نہ جائیں اور یہ کہ بھوک کی تکلیف اُٹھانے میں اُن (بھوکوں) کے ساتھ یگانگت حاصل ہو۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کے روزوں کو قبول فرمائے، ہر قسم کے لغویات سے محفوظ رکھے۔ آمین



توبہ کی اہمیت اور اُس کا طریقہ

از قلم: فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

رمضان المبارک کی آمد آمد ہے، یہ روح کے تزکیہ اور تطہیر کا مہینہ ہے، کسی برتن میں کوئی اچھی چیز ڈالنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اُس کو اچھی طرح صاف کر لیا جائے اور اُس میں کوئی گندگی باقی نہ رہے، انسان کا دل بھی ایک برتن ہے، جس کی اصلاح سے انسان کا پورا وجود صالحیت کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے، اور جس کے بگاڑ سے اُس کا پورا وجود بگاڑ کا شکار ہو جاتا ہے، جیسے ظاہری گندگی اور میل کچیل سے انسان کا جسم اور اس کا لباس گندا ہو جاتا ہے، اور اس میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے، اسی طرح گناہ بھی ایک روحانی گندگی ہے، جو قلب کے پیمانی کو ناپاک اور گندہ کر دیتا ہے، اس کو صاف کرنے کا طریقہ توبہ ہے، اللہ تعالیٰ کی شانِ کری می ہے کہ انسان کتنا بھی بڑا گناہ کرے توبہ سے گناہ کا داغ دھل جاتا ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص کفر و شرک میں مبتلا ہو اور وہ اُس سے تائب ہو جائے تب بھی اُس کو اپنے جرم سے معافی مل جاتی ہے۔

دراصل انسان خیر و شر کا مجموعہ ہے، یہ نیکیوں پر قادر ہے؛ لیکن بُرائیوں سے عاجز نہیں، نہ فرشتہ ہے کہ بُرائی کا خیال تک دل میں نہ آئے، اور نہ شیطان ہے کہ ضلالت و گمراہی سے کبھی دل خالی ہی نہ ہو؛ اس لیے اُسے اس ”امتحان گاہ“ میں رکھا گیا ہے کہ دیکھا جائے کہ اس کی نیکیاں بُرائیوں پر فتح پاتی ہیں یا بُرائیاں نیکیوں پر غالب آتی ہیں، انبیاء کے سوا کوئی انسان نہیں، جو غلطی اور خطا سے یکسر محفوظ ہو، گویا غلطی انسان کی سرشت میں ہے، اگر یہ نہ ہو تو انسان فرشتہ بن جائے، انبیاء کے بعد سب سے کامل انسان وہ لوگ ہوتے ہیں، جن کو انبیاء کی رفاقت اور نصرت کے لیے منتخب کیا جاتا ہے؛ لیکن اس مقام و مرتبہ کے باوجود بعض اوقات پیغمبروں کے اصحاب سے بھی غلطیاں صادر ہوئی ہیں؛ البتہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان کو فوراً ہی اپنے گناہ پر ندامت اور پشیمانی ہوتی ہے، اور اس طرح یہی نہیں کہ اُن کی یہ ندامت اس گناہ کی تلافی کا سامان بن جاتی ہے؛ بلکہ ان کا اس طرح گناہ کرنا اور پھر گناہ کے بعد اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان کے مطابق پشیمان ہونا بجائے خود اُمت کے لیے اُسوہ قرار پاتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کو اس طرح ارشاد فرمایا کہ: ہر ابنِ آدم ضرور ہی خطا کرتا ہے؛ لیکن بہترین خطا کار وہ ہیں جو گناہ کا ارتکاب کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے دروازہ مغفرت پر اپنی ندامت کی پیشانی رکھ

دیں اور توبہ کر لیں: ”خَيْرُ الْخَطَائِينَ التَّوَّابُونَ“ مخلوق کا مزاج یہ ہے کہ وہ انتقام لے کر خوش ہوتی ہے، اس سے اس کے جذبہ انا کی تسکین ہوتی ہے اور کبچہ ٹھنڈا ہوتا ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات والاصفات پر رحمت کا غلبہ اور وہ رحمن ورحیم اور غفور وکریم ہے؛ اسی لیے اُسے گناہ گاروں اور کوتاہ کاروں کو معاف کر کے خوشی ہوتی ہے، انسان انتقام کے لیے بہانے ڈھونڈتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہانوں سے مغفرت کے فیصلے فرماتے ہیں، کسی نے حج کر لیا تو پچھلی پوری زندگی کا گناہ معاف کر دیا، عمرہ کر لیا تو ایک عمرہ سے دوسرے عمرہ کے درمیان کے گناہ معاف ہو گئے، بعض روزے ہیں کہ پورے صغیرہ گناہوں کے کفارہ ہیں، نمازیں بھی جسم سے گناہوں کے میل کو صاف کرتی ہیں، صدقات بھی گناہوں کا کفارہ بنتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی ہے کہ چھوٹے چھوٹے عمل کی بنیاد پر انسان کے گناہ معاف ہوتے جائیں۔

قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کو ”عَفُو“ یعنی بہت معاف کرنے والا قرار دیا ہے، عربی زبان میں ”عَفُو“ کے اصل معنی مٹانے کے ہیں (القاموس المحیط: ۱۱۸۱)، پس ”عَفُو“ کے معنی مٹا دینے والے کے ہوئے، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن گناہوں کو معاف کرتے ہیں ان کو بالکل ہی مٹا دیتے ہیں اور شاید نامہ اعمال سے بھی محو فرمادیتے ہیں، یہ کتنی بڑی شانِ کریمی ہے! انسان کسی کو معاف بھی کر دے تو وہ غلطی کو لوہ قلب سے مٹانے کو تیار نہیں ہوتا، وہ وقتی طور پر جذبہ انتقال کو دبا لیتا ہے اور جب کبھی تعلقات میں ناہمواری آتی ہے تو پھر اُس کو اُس کا نامہ اعمال دکھانے اور چھپے ہوئے واقعات کو منظرِ عام پر لانے کے لیے کمر کس لیتا ہے، سیاست کی دنیا میں تو اکثر اسکیٹنڈل اسی طرح ظہور میں آتے ہیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں درگزر کا دامن اتنا وسیع ہے کہ جب اللہ کسی بات کو معاف فرماتے ہیں، تو اس کو ریکارڈ سے ہی حذف کر دیتے ہیں۔

توبہ کا تصور جہاں آخرت میں انسان کے لیے نافع ہے، وہیں دنیا میں بھی کچھ کم نافع نہیں، اگر ایک کے اندر نا اُمیدی اور مایوسی پیدا ہوگی، جرم کا حوصلہ بڑھے اور جرم پیشہ اذہان سوچنے لگیں گے کہ جب دوزخ مقرر رہی ہو چکی ہے، تو دنیا ہی کی لذت اٹھالی جائے اور جہاں ایک دفعہ جرم کا ارتکاب ہوا، دس اور سہی، اس سے جرم کو بڑھاوا ملے گا اور سماج میں زندگی اجیرن ہو جائے گی؛ اس لیے توبہ کا تصور دنیا میں بھی ایک بڑی رحمت ہے اور اس سے سماج کا امن و آشتی متعلق ہے۔

توبہ کے لیے اصل محرک اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کا احساس ہے، انسان اپنے گناہ پر ندامت اور پشیمانی محسوس کرے، اپنے گناہوں کو یاد کر کے اس کا دل لرزنے لگے، خدا کے سامنے اُس کے ہونٹ کپکپانے لگیں، آنکھوں کے آنسو دل کی بے چینی اور اضطراب کی گواہی دیں اور اس کا ضمیر گناہوں کے بوجھ تلے اپنے آپ کو

دبا ہوا محسوس کرے، اس پشیمانی اور سچی ندامت کے بغیر محض زبان سے توبہ کے الفاظ کہہ دینا کافی نہیں، انسان پر اپنی قلبی کیفیت کے لحاظ سے گناہ کا کیا اثر مرتب ہوتا ہے؟ اس کو آپ نے ایک مثال سے واضح فرمایا کہ نیک اور سچا مسلمان جب کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو اُسے ایسا لگتا ہے کہ جیسے اُس کے سر پر پہاڑ جیسا بوجھ ہے اور جو شخص گناہوں کا عادی ہو جاتا ہے اُسے گناہ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی مکھی ہے جو ناک پر بیٹھی ہوئی ہے، ذرا ہاتھ ہلایا اور اُٹ گئی۔ (بخاری، باب التوبۃ، حدیث نمبر: ۶۳۰۸) ایک اور روایت میں ہے کہ جب کوئی شخص گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو اُس کے قلب پر ایک سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے، اگر توبہ کر لے تو دھل جاتا ہے اور توبہ نہ کرے تو جوں جوں گناہ کرتا جاتا ہے قلب پر دھبے بڑھتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ پورا قلب سیاہ ہو جاتا ہے، اب انسان گناہ کرتا ہے اور اُس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ (مستدرک حاکم، باب تفسیر سورۃ المطففین، حدیث نمبر: ۳۹۰۸)

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لیے بے توفیقی سے بڑھ کر کوئی محرومی نہیں، جیسے دنیا میں بہت سے امراض ہیں جس سے آدمی دوچار ہوتا ہے؛ لیکن سچ پوچھیے تو شاید ”جنون“ سے بڑھ کر کوئی مرض نہیں؛ اس لیے نہیں کہ اُس میں تکلیف زیادہ ہوتی ہے؛ بلکہ اس لیے کہ اس میں مریض کو اپنے مریض ہونے کا احساس نہیں رہتا، وہ بیمار ہوتا ہے؛ لیکن اپنے آپ کو صحت مند تصور کرتا ہے، اس کو علاج کی ضرورت ہوتی ہے؛ لیکن وہ اپنے آپ کو علاج کی ضرورت سے بری سمجھتا ہے، اسی طرح توبہ سے بے توفیقی ایک ”روحانی جنون“ ہے کہ انسان گناہ میں مبتلا ہے، سر سے پاؤں تک گناہ میں ڈوبا ہوا ہے؛ لیکن اپنے گناہ گار ہونے کا کوئی احساس نہیں کرتا اور کبھی یہ خیال نہیں کرتا، کہ خدا کی چوکھٹ پر ندامت اور شرمندگی کی پیشانی رکھے اور التجا کی زبان کھولے، اللہ نہ کرے کہ کوئی مسلمان ایسی محرومی اور بدبختی سے دوچار ہو۔

توبہ کے لیے پچھلے کیے پر ندامت کے ساتھ مستقبل کا عزم مصمم بھی ضروری ہے، آدمی اپنے دل میں یہ ارادہ رکھے کہ وہ آئندہ کبھی بھی اس غلطی کا اعادہ نہ کرے گا، اس بات کا نام توبہ نہیں کہ ابھی غلطی کیے ہوئے دیتے ہیں پھر کبھی گناہ ہو گیا تو پھر توبہ کر لی جائے گی، کہ بقول شاعر: ”کم بخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی“ کیوں کہ اس طرح کی سوچ اس بات کی علامت ہے، کہ وہ زبان اور دل کی رفاقت کے ساتھ پشیمانی کا اظہار نہیں کر رہا ہے اور اپنی توبہ میں صادق القول نہیں ہے۔

ہر گناہ سے توبہ کا ایک ہی طریقہ نہیں؛ بلکہ اس کے لیے بھی شریعت نے کچھ اصول مقرر کر دیے ہیں، جن گناہوں کے لیے قرآن وحدیث میں کوئی کفارہ مقرر کر دیا گیا ہو تو اُن کی توبہ یہ ہے کہ کفارہ ادا کیا جائے، مثلاً کسی شخص نے جان بوجھ کر روزہ توڑ دیا تو ساٹھ روزے رکھنا اور اس پر قدرت نہ ہو، تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا

اس کا کفارہ ہے، (درمختار: ۱۰۹/۲) قسم کھائی؛ لیکن اسے پورا نہ کر پایا تو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا دس مسکینوں کو کپڑا پہنانا ہے، (المائدۃ: ۸۹) ان گناہوں سے توبہ یہی ہے کہ ان کا کفارہ ادا کر دیا جائے۔

بعض کوتاہیوں پر شریعت نے قضا واجب قرار دی ہے، جیسے کسی شخص سے عذر کی بنا پر روزہ فوت ہو گیا تو اُس پر ان روزوں کی قضا واجب ہے، ہوش و حواس کی حالت میں نمازیں قضا ہو گئیں، تو ان کی بھی قضا واجب ہے، یہ گویا بندوں پر اللہ تعالیٰ کا دین ہے، جس کی ادائیگی واجب ہے، ان کوتاہیوں کی توبہ یہی ہے کہ فوت شدہ نمازوں کی قضا کی جائے، اسی طرح بعض عبادتوں کے فوت ہونے پر فدیہ واجب قرار دیا ہے، جیسے کوئی شخص بہت ضعیف یا مریض ہو، روزہ رکھنے پر قادر نہیں اور بظاہر مستقبل قریب میں صحت یاب ہونے کی بھی توقع نہیں، تو ایسے شخص کے لیے یہ سہولت ہے کہ ہر روزہ کے عوض ایک فدیہ ادا کر دے، یعنی ایک غریب ہتھانہ شخص کو دو پہر اور رات کا کھانا کھائے، یا صدقہ فطر کے بقدر غلہ دے دے، اصل میں تو یہ حکم روزہ کے سلسلہ میں آیا ہے (البقرہ: ۱۸۴)؛ لیکن فقہاء نے روزوں پر قیاس کرتے ہوئے نماز میں بھی اس کی اجازت دی ہے کہ جن لوگوں کی نماز فوت ہوگئی اور وہ اب نماز ادا کرنے کے لائق نہ رہے، یا اُن کا انتقال ہو گیا تو اُن کی فوت شدہ نمازوں کا فدیہ ادا کر دیا جائے (درمختار: ۱۱۹/۲)، ان کوتاہیوں کی توبہ یہی ہے، خاص کر جب کسی شخص کا انتقال ہو جائے تو بجائے اس کے کہ لہو و لعب میں پیسے خرچ کیے جائیں ”کفارہ“ اور ”فدیہ“ ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ ان سے متوفی کو راحت حاصل ہوگی۔

کچھ گناہ اور کوتاہیاں بندوں کے حقوق سے متعلق ہیں، یہ حقوق دو طرح کے ہیں: مالی اور غیر مالی، انسان سے متعلق مالی حقوق میں کوتاہیوں کی توبہ یہ ہے کہ صاحبِ حق کو اُس کا حق ادا کر دیا جائے، یا اُس سے معاف کر لیا جائے، کسی کا دین باقی ہو، بلا اجازت کسی کی چیز استعمال کر لی ہو، کسی کو اُس کے حق سے محروم کر دیا ہو، میراث میں اپنے حق سے زیادہ لے لیا ہو، یہ تمام صورتیں مالی حق تلفی کی ہیں، ان کا ادا کرنا ضروری ہے اور اگر ادا کرنے کے لائق نہ ہو تو ضروری ہے کہ اس سے معذرت کرے اور اس کو راضی کر کے اپنا گناہ معاف کرالے، بعض حقوق غیر مالی ہوتے ہیں، جیسے: کسی کو گالی دی، کسی کا تمسخر کیا اور بُرا بھلا کہا، کسی کی غیبت کی، بہتان لگایا، یہ تمام باتیں حق تلفی اور گناہ کے دائرہ میں آتی ہیں، ان گناہوں کی توبہ یہ ہے کہ جس کے ساتھ زیادتی کی ہے، اُس سے اپنی غلطی کی معافی مانگی جائے، یہ ضروری نہیں کہ اس بات کی بھی وضاحت کی جائے کہ اُس نے اُس کے بارے میں کیا کیا کہا ہے اور کیا کچھ زیادتی کی ہے؟ بلکہ مبہم طور پر معاف کرنے والا یوں کہہ دے کہ تم سے جو کچھ بھی غلطی ہوئی ہو میں اُسے معاف کرتا ہوں، تو یہ بھی کافی ہے، ایک ایک غلطی کا شمار کرنا ضروری نہیں، اگر اللہ کے کسی بندہ کے حق

میں زیادتی ہوگئی ہو تو وہ بڑا ہو یا چھوٹا، زیادہ باعزت ہو یا کم معزز، عذر خواہی اور غمخوواہی میں تکلف نہیں کرنا چاہیے؛ کیوں کہ حقوق العباد میں ہونے والی کوتاہیاں اللہ تعالیٰ معاف نہیں کریں گے، جب تک کہ خود صاحب معاملہ معاف نہ کر دے، یہاں تک کہ شہادت اور اللہ کے راستہ میں جان کی سپردگی جیسا عظیم عمل بھی انسان کو انسان کے حق میں ہونے والی کوتاہیوں سے بچا نہیں سکتا؛ اس لیے اس میں شرم و عار کو رکاوٹ نہ بنانا چاہیے۔

ان گناہوں کے علاوہ جو گناہ ہیں، جیسے: جھوٹ بولنا، یا ایسا ملک - جہاں شرعی حدود نافذ نہ ہوتی ہوں - میں ایسے کسی جرم کا مرتکب ہونا جس پر خود اللہ کی طرف سے شرعی سزائیں مقرر ہیں، جیسے: زنا، چوری، کسی مسلمان پاک دامن شخص پر تہمت اندازی، شراب نوشی وغیرہ، ان کے لیے بھی خوب گڑگڑا کر توبہ کرنا چاہیے اور یوں بھی استغفار کی کثرت رکھنی چاہیے؛ تاکہ یہ اس کے دانستہ اور نادانستہ گناہوں کا کفارہ بن جائے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات ایک ہی مجلس میں ستر ستر بار استغفار فرمایا کرتے تھے، رمضان المبارک کا مہینہ جہاں نفل عبادت، قرآن مجید کی تلاوت، انفاق اور دعاؤں کا مہینہ ہے، وہیں توبہ و استغفار کے لیے بھی اس سے بہتر کوئی موسم نہیں، جس میں اللہ تعالیٰ کا دروازہ رحمت کھلا رہتا ہے اور دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔



یتیموں کا خیال رکھنا

از قلم: حضرت مولانا مفتی سید محمد عفاف صاحب منصور پوری (صدر المدینہ جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امر وہہ)

ہر انسان شرافت و عزت کا متلاشی ہوتا ہے، اس کے لیے لازمی چیز یہ ہے کہ وہ بلند روایات کا حامل ہو، وہ صرف اپنی زندگی میں مگن ہو کر قیمتی اوقات کو خرچ کرنے والا نہ ہو؛ بلکہ دوسروں کا درد بھی اپنے دل کے اندر لیے ہوئے ہو، وہ کسی دکھی انسان کو دیکھ کر دکھ محسوس کرتا ہو، اور اس فکر میں مبتلا ہو جاتا ہو کہ کیسے میں اُس کی زندگی سے دکھ کو دور کر سکتا ہوں؛ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث مبارکہ میں جگہ جگہ یتیموں اور بیواؤں کے حقوق کو ادا کرنے کا حکم دیا ہے؛ اس لیے کہ یہ انسانوں کا وہ طبقہ ہے جو سرپرستوں سے محروم ہونے کی وجہ سے تنگی اور گھٹن کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اور اس بات کا محتاج ہوتا ہے کہ لوگ اُن کی مدد کے لیے آگے بڑھیں، باپ کا سایہ اگر سر سے اٹھ گیا ہے تو چچا اُن کے لیے سائبان کا کام کرنے والا ہو، پڑوسی اُن کے لیے نگہبان کا کام کرنے والے ہوں، دوسرے رشتہ دار اُن کے لیے ہمدردی کا ایسا جذبہ اپنے دل کے اندر رکھنے والے ہوں کہ اُس یتیم کو یہ احساس نہ ہو پائے کہ میں باپ کی شفقتوں سے محروم ہو گیا ہوں، اس طرح کی روایات جس خاندان کے اندر ہوں گی اللہ کی نگاہ میں وہ معزز و محترم قرار دیا جائے گا۔

یتیمی کا درد

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیمی کے زمانے میں آنکھیں کھولی ہیں، آپؐ اس دنیا میں تشریف لائے تو آپؐ کی آمد سے چھ ماہ قبل ہی آپؐ کے والد محترم اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، آفتابِ نبوت طلوع ہو رہا ہے تو شفقتِ پدری سے محروم ہے؛ لیکن اللہ کی خصوصی رحمتیں، فضل و عنایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو روزِ اول سے حاصل رہیں، اور پھر آزمائش دیکھیے کہ یتیم بچہ چھ سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو وہ خلیق، شفیق، مہربان، جان سے زیادہ عزیز رکھنے والی ماں بھی اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے، اور محض چھ سال کی عمر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم والدین کی محبتوں سے محروم ہو جاتے ہیں، آزمائش پر آزمائش، دادا جان کی کفالت ملتی ہے، وہ بھی زیادہ دنوں تک حاصل نہیں رہتی، اُس سے بھی جلد ہی محرومی ہو جاتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو احساس ہے کہ یتیمی کا درد کیا

درد ہوتا ہے، باپ کی شفقت کا سایہ سر سے اٹھ جانا یہ انسان کے لیے کیسی مشقت کی گھڑی ہوتی ہے، ماں کی محبت سے محروم ہو جانا یہ انسان کے لیے کیسے امتحان کی چیز ہوتی ہے، ان تمام مراحل سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گزرے تھے؛ اس لیے آپ نے امت کے سامنے یتیمی کا درد بیان کیا، اور لوگوں کو یہ تاکید فرمائی کہ وہ بچہ جو بچپن میں ماں کی یا باپ کی شفقت سے محروم ہو گیا ہو، تو اُسے اپنے قریب کر کے اُس کا دل بڑا کرنے کی کوشش کرو۔

یتیم کسے کہتے ہیں؟

امام ابو بکر حصاص فرماتے ہیں: اصلاً والدین میں سے کسی ایک سے بھی محروم ہونے والے کو یتیم کہا جاسکتا ہے؛ لیکن مطلقاً اصطلاح عام میں باپ سے محروم ہونے والے کو ہی یتیم کہتے ہیں خواہ والدہ بقید حیات ہی کیوں نہ ہوں۔ یتیم کے سلسلہ میں قرآن و سنت میں مذکور احکام کا اطلاق بھی اُنہی افراد پر ہوگا جو باپ کی شفقت سے محروم ہو گئے ہوں اور بالغ نہ ہوئے ہوں؛ تاہم بلوغ کے بعد بھی مجازاً یتیم کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ (احکام القرآن للجصاص: ۱۲/۲)

یتیموں کی مدد

عن ابي هريرة - رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: الساعي على الأرملة والمسكين كالمجاهد في سبيل الله و كالذي يصوم النهار ويقوم الليل.

(أخرجه البخاري، النفقات، فضل النفقة على الأهل، ح: ۵۳۵۳)

”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بیواؤں، مسکینوں اور یتیموں کی مدد کرنے والے، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کا سا ثواب پاتے ہیں اور ان عبادت گزاروں کے برابر اجر حاصل کرنے والے ہیں جو دن بھر روزہ رکھتے ہوں اور رات بھر عبادت میں مشغول رہتے ہوں“۔

جو شخص اپنے کھانے میں کسی یتیم کو بھی شامل کر لے گا، جو اپنے ساتھ کسی بیوہ کے لیے بھی کھانے کا بندوبست کر لے گا، جو اپنے گھر کے ممبران کے ساتھ کسی مسکین کے لیے بھی کھانے کا انتظام کر لے گا، اُس کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ثواب کا وعدہ فرما رہے ہیں کہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا، کہاں جان کو ہتھیلی پر رکھ کر دشمنوں کے مقابلہ میں جہاد کے لیے نکلنا، اور کہاں گھر بیٹھے کسی یتیم، بیوہ اور مسکین کی مدد کر دینا، دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے؛ لیکن اللہ نے اجر کے اعتبار سے دونوں عمل کو یکساں کر دیا ہے؛ اس لیے کہ بیواؤں اور مسکین کا مسلسل خیال رکھنا اور مدد کرنا اُسی کے لیے ممکن ہے جو نفس کے مجاہدے کے ساتھ ساتھ صبر کا بھی عادی ہو؛ ورنہ عام طور پر اس طرح کے معاملات میں لوگ کچھ دنوں کے بعد دست پڑ جاتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی ترغیب دی ہے کہ: اپنے دل کو کشادہ رکھو، صرف اپنی زندگی میں مگن نہ رہو، اپنے آس پاس رہنے والے اُن کمزور لوگوں کو بھی دیکھو جو تنگی کی زندگی گزار رہے ہیں، اور اللہ نے اُن کو ماں باپ کی شفقت سے محروم کر کے آزمائش میں ڈالا ہے، یہ آزمائش صرف یتیموں اور مسکینوں کی نہیں؛ بلکہ یہ آزمائش آسودہ حال لوگوں کی بھی ہے، درحقیقت آزمائش اُن لوگوں کی ہے جن کو اللہ نے اچھے حالات سے نوازا ہے، وہ اگر اُن کے درمیان ایسے لوگوں کو رکھتا ہے تو وہ اُن کو جانچ رہا ہے کہ وہ اُن کی مدد و تعاون کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔

یاد رکھیے ہمیں اسی راستے سے عزت ملے گی، خاموشی کے ساتھ یتیموں اور ضرورت مندوں کا تعاون کیا جائے، آپ لوگوں کے دلوں کو جیتنے میں کامیاب ہوں گے اور اللہ انسانی دلوں کے اندر آپ کی محبت کو جاں گزیریں فرمادے گا۔

یتیم کی کفالت

عن أم سعيد بنت مرة الفهري عن أبيها عن النبي قال: أنا وكافل اليتيم في الجنة

کہاتین۔ (اخرجه الحميدي، ح: ۸۳۸ والبيهقي في السنن: ۲۸۳/۶)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا (اور آپ نے درمیانی و شہادت کی اُنکلی کی جانب اشارہ کیا) جنت میں، میں اور یتیم کی کفالت کرنے والے ایسے ہوں گے جیسے یہ دونوں اُنگلیاں، یعنی جتنا قرب ان دو انگلیوں میں دُکھ رہا ہے، اتنا ہی قرب مجھ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والوں میں ہوگا۔

کیسی خوش نصیبی کی بات ہے کہ روزِ محشر انسان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت اور ساتھ نصیب ہو جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کو حاصل کرنے کے لیے کسی ایک یتیم کو اپنے گھر کا ممبر بنا لیجیے۔ اپنے دل میں یہ طے کر لیجیے کہ مجھے اتنے دن تک فلاں یتیم کی کفالت اور اُس کی خبر گیری کرنی ہے۔ اللہ رب العزت والجلال وہ مقام عطا فرمائیں گے کہ جس کا ہم تصور نہیں کر سکتے۔

یتیم کو کھانے میں شامل کرنا

عن أبي بكر بن حفص أن عبد الله رضي الله تعالى عنه كان لا يأكل طعاما إلا وعلى

خوانه یتیم۔ (أخرجه الإمام أحمد في الزهد، ح: ۱۹۴۹)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ایک جلیل القدر صحابی ہیں، جو اتباع سنت کے باب میں ضرب المثل ہیں،

اُن کے یہاں دسترخوان پر اکثر و بیشتر کوئی نہ کوئی یتیم ضرور ہوا کرتا تھا، وہ اس کا اہتمام کیا کرتے تھے کہ کھانے میں کوئی یتیم بھی شامل رہے۔

عن الحسن أن یتیمًا كان يحضر طعام ابن عمر[ؓ] وفي رواية أنه كان إذا تغدى أو تعشى دعا من حوله من الیتامی! فدعا بطعام ذات یوم، فطلب یتیمه فلم یجده فجاء بعد مسافرغ ابن عمر فدعا له ابن عمر بطعام لم یکن عندهم فجاءه بسویق وعسل فقال دونک هذا. (أخرجہ ابن المبارک فی البر والصلوة، ح: ۲۱۳، وأحمد فی الزهد، ح: ۱۰۵۱)

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک یتیم حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ دوپہر یا شام کے کھانے پر آس پاس کے یتیموں کو مدعو فرماتے تھے۔

ایک دن آپ نے کھانا منگا یا پھر یتیم کو بلایا، تو وہ ملے نہیں، اس کے بعد جب حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کھانے سے فارغ ہو گئے تو وہ یتیم آئے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اُن کے لیے کھانا منگا یا، تو وہ ختم ہو چکا تھا؛ اس لیے آپ نے ستوا اور شہد منگا یا اور اُن کو پیش کیا۔

یتیم کے ساتھ حسن سلوک کی فضیلت

اخرج الفقيه أبو الليث السمرقنديّ باسناده عن عبد الله بن أبي أوفى[ؓ] يقول قال: رسول الله صلى الله عليه وسلم: من مسح على رأس یتیم رحمة كتب الله له بكل شعرة مرت عليها يده حسنة ومحاه عنه بكل شعرة سيئة ورفع له بكل شعرة درجة. (تبيين الغافلين: ۳۴۹/۱)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی یتیم کے سر پر شفقت و رحمت کا ہاتھ رکھے گا تو اللہ تعالیٰ یتیم کے ہر اُس بال کے بدلے جس پر اُس کا ہاتھ لگا ہوگا ایک نیکی عطا فرمائیں گے، ایک گناہ معاف کریں گے اور ایک درجہ بلند فرمائیں گے۔

عن ابن عباس[ؓ] قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من ضم یتیمًا من بین یتامی المسلمین إلى طعامه وشرابه حتى یغنیه الله تعالیٰ أو جب الله تعالیٰ له الجنة البتة إلا أن یعمل عملاً لا یغفر الله له. (تبيين الغافلين: ۲۴۹/۱)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی مسلمان یتیم کے کھانے پینے کی ضمانت لے لے، تا آنکہ اللہ پاک اُس کو غنی بنا دیں تو اللہ تعالیٰ یقینی طور پر اُس کے لیے جنت واجب کر دیں گے، الا یہ کہ وہ کوئی ایسا عمل کرے جسے اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرماتے۔

دل کی سختی کیسے دُور ہو

عن أبي الدرداء أن رجلا جاء إلى النبي صلى الله عليه وسلم فشكا إليه قسوة القلب، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: أتحب أن يلين قلبك وتدرک حاجتك؟ فامسح رأس اليتيم وأطعمه يلن قلبك ويدرك حاجتك؟ (رواه الطبراني بحواله الدر المنصذ: ۲۷۰۱)

ایک صحابیؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے اپنے دل میں بڑی سختی محسوس ہوتی ہے، قساوت قلبی کا میں شکار ہوں، مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجیے کہ دل کی سختی نرمی میں تبدیل ہو جائے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارا دل نرم ہو جائے، اور تمہاری ضروریات و حاجات پوری جائیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہی میری خواہش ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یتیم کے ساتھ رحم دلی کا معاملہ کیا کرو، اس کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو، اپنے کھانے میں اُس کو شریک کیا کرو، اللہ تعالیٰ تمہارے دل کو نرم فرمائیں گے اور تمہاری ضرورت پوری کریں گے۔

رحمتِ الہیہ کا استحقاق

قال النبي صلى الله عليه وسلم: والذي بعثني بالحق لا يعذب الله يوم القيامة من رحم اليتيم وألان له الكلام ولم يتناول على جاره بفضل ما أتانا الله. (رواه الطبراني بحواله الدر المنصذ: ۴۷۰۱)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم اُس ذات کی جس نے مجھے حق کا پیغمبر بنا کر بھیجا، اللہ قیامت کے دن اُس آدمی کو عذاب نہیں دیں گے جو یتیم کے ساتھ رحم دلی کا معاملہ کرنے والا ہو، نرم زبان استعمال کرنے والا ہو اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں میں پڑوسیوں کا حق بھی ادا کرنے والا ہو۔ یہ تین صفت جس انسان کے اندر ہوں گی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قسم کھا کر فرماتے ہیں اللہ پاک قیامت

کے دن اُس کو عذاب نہیں دیں گے۔ ان تمام روایات و احادیث کو ذکر کرنے کا منشا یہ ہے کہ انسان ان ہدایات پر عمل کر کے اللہ کی نگاہ میں تقرب کا مقام حاصل کرنے والا بن جائے، اور صرف اپنی ضروریات کو پیش نظر نہ رکھے؛ بلکہ ساتھ رہنے والے لوگوں کی ضروریات کو بھی نگاہ میں رکھے، اگر ہم میں سے ہر شخص اس بات کا فکر مند ہو کہ مجھے کم سے کم ایک ضرورت مند کی کفالت کرنی ہے، تو کسی ضرورت مند کو ہمارے پاس آکر اپنی ضرورت کو بیان کرنے کی نوبت نہیں آئے گی، ہمارے دلوں میں اگر فکر پیدا ہو جائے گی تو ہم اُن کی ضرورت کو خود پورا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے؛ لیکن اب صورتِ حال ایسی ہے کہ آدمی اپنے علاوہ کسی کے بارے میں سوچتا ہی نہیں، بغیر کہے کسی کی مدد کرنا تو دُور کی بات ہے، اگر واقعاً ضرورت مند تعاون کی درخواست کرتا بھی ہے تو ہم اُس کی مدد کرتے ہوئے کتراتے ہیں، جب کہ ایک مومن اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم ضرورت مند کو یہ موقع ہی نہ دیں کہ وہ ہمارے سامنے اپنی ضرورت کو بیان کرے، ہم اظہارِ ضرورت سے پہلے ہی اُس کی ضرورت کو پورا کرنے والے بن جائیں۔



قلب کو اخلاقِ محمودہ سے مزین کرنے کا بیان

از قلم: مفتی محمد سلطان خان قاسمی، امام و خطیب مسجد ابو بکر صدیق، ڈی جے، ہلی، بنگلور

پچھلی قسط میں صبر کی فضیلت اور صبر کو انسان کے ساتھ خاص کرنے کے ساتھ ساتھ صبر کا اعلیٰ و متوسط اور ادنیٰ درجہ بیان کیا گیا تھا، اب مندرجہ ذیل قسط میں زندگی کے کن کن حالتوں میں صبر کرنا چاہیے اور صبر کے اقسام کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

انسان تمام عمر ہر حالت میں صبر کا محتاج ہے؛ کیوں کہ دنیا میں دو ہی حالتیں ہیں: یا تو اپنی مرضی کے موافق یا مخالفت و ناگوار۔

خوش حالی میں صبر کی ضرورت

(۱) بس اگر اپنی مرضی و منشاء کے موافق حالت ہے، تندرستی، تو نگری، اولاد، عزت، جاہ سب کچھ حاصل ہے تب تو صبر کی نہایت ضرورت ہے؛ کیوں کہ اگر نفس کی باگ نہ تھامے گا تو یہ سرکش شرارت کرے گا اور تنعم و تملذ میں بے باکانہ قدم رکھے گا، یعنی خواہشات کے پیچھے ہو لے گا اور ابتدا و انتہا سب کو بھول جائے گا؛ اسی لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں:

”بلینا بفتنة الضراء فصبرنا، و بلینا بفتنة السراء فلم يصبر . (رواه الخرائطي في اعتدال

القلوب: ۲۱۹، عن سیدنا معاذ بن جبل، بحوالہ حاشیہ أربعین فی اصول الدین)

”کہ ہم تنگی اور فقر کے فتنہ میں ہوتے تو صابر نکلے؛ مگر فراخی اور وسعت کے فتنہ میں مبتلا ہوئے تو صبر

نہ کر سکے۔“ (تبلغ دین: ص ۱۷۸، ترجمہ از: أربعین فی اصول الدین: ۳۷۷)

فراخی میں صبر کرنے کے یعنی معنی ہیں کہ قلب کا میلان اس دنیا کے متاع کی جانب نہ ہو، عنقریب مجھ سے واپس لے لیا جائے گا، پس جب تک وہ میرے پاس ہے اُس وقت تک مجھے شکر ادا کرنا چاہیے اور جب وہ چلی جائے تو رنجیدہ نہ ہونا چاہیے اور اگر خدا نخواستہ غفلت اور اتباع ہو میں ہو گیا تو غافل کیا جائے گا۔

نکتہ: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس قول میں ہم کو نصیحت ملتی ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم

اجمعین فرماتے ہیں کہ اللہ نے ہم کو تنگی میں مبتلا کیا تو ہم نے صبر کیا اور برداشت کیا اور جب اللہ نے وسعت عطا فرمائی تو ہم صبر نہ کر سکے، یعنی ہمارا قلبی میلان اس کی طرف مائل ہوا (جب کہ یہ فطری چیز ہے)۔
ذرا غور کریں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم قلبی میلان کو صبر سے منہ پھیرنا تصور کر رہے ہیں؛ حالاں کہ ہمارا ہر وقت دنیا کے کمانے، وسعت بڑھانے اور اخراجات کے اضافے کی کوشش میں خرچ ہوتا ہے، پھر بھی اس طرف توجہ نہیں ہوتی۔
اسی لیے کہا گیا ہے کہ ہر بلاء و مصیبت پر ہر ایک مؤمن صبر کر لیتا ہے اور قناعت پر صدیقین ہی باقی رہتے ہیں۔
(الاربعین فی اصول الدین: ۳۷۷)

(۲) طاعات پر صبر

دوسری صورت یہ ہے کہ خواہش کے مخالف حالت ہو اور اس کی چار قسمیں ہیں: پہلی قسم: اُن طاعات پر صبر کرنا ہے جن پر نفس گھبراتا اور بھاگتا ہے، مثلاً محض کسل و سستی کی وجہ سے نماز پڑھنی ناگوار ہے اور بخل کی وجہ سے زکاۃ دینی گراں گزرتی ہے اور کسل و بخل دونوں کی وجہ سے حج اور جہاد کرنا دشوار ہے، پس نفس پر جبر کرنا اور طاعات پر صبر کرنا (طاعات میں اس کو جمانا) اگرچہ کتنا ہی گراں گزرے؛ مگر ضروری ہے کہ اس گرائی کا تحمل ہو اور نفس کو زیر کرے اور جب نفس مطیع ہو گیا تو پھر صبر کی تین قسمیں ہوں گی۔ (تبلیغ دین: ۱۸۸، ترجمہ از: الاربعین فی اصول الدین: ۳۷۸)

عبادت کے شروع، درمیان اور ختم پر صبر کرنا

اگر نفس مطیع و فرماں بردار ہو گیا تو حضرت حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے صبر کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں: (۱) عبادت کے شروع کرنے سے پہلے اخلاص پیدا کرنا (یعنی اپنی نیت کو اللہ کے لیے خاص کرنا کہ میں یہ عبادت اللہ ہی کے لیے کرنے جا رہا ہوں) ریاء وغیرہ کا دور کرنا اور نفس کے مکرو فریب سے بچنا۔
دوم: حالت عبادت میں صبر کرنا ضروری ہے؛ تاکہ آداب و سنن و مستحبات کے ادا کرنے میں کسل و کاہلی نہ ہو اور عبادت میں اول سے آخر تک حضور قلب قائم رہے کہ شیطان و وساوس اور نفس کے خطرات ایک لمحہ کے لیے بھی پاس نہ آئیں۔

سوم: عبادت سے فارغ ہونے کے بعد صبر کی جدا (الگ سے ضرور ہے) کہ ریاء و سمعہ کے طور پر اس کا اظہار اور لوگوں سے اپنی عبادت کا ذکر کرتا نہ پھرے، غرض صبر کی ہر جگہ ضرورت ہے اور وہ ہر حالت میں نفس کو شاق گزرتا ہے، اگر نفس کی خواہش کے مخالف حالت ہو، تو صبر کی دوسری قسم۔

معصیت سے صبر کرنے کی ضرورت

یعنی نفس کو معصیت سے روکنا ہے (اور یہاں پر لفظ صبر رکنے کے معنی میں مستعمل ہے) اور خاص کر ایسی معصیت سے جس کا نفس عادی ہو رہا ہو اور اس کا مزہ بڑھا ہوا ہو؛ کیوں کہ یہاں خدائی لشکر یعنی عقل اور دین سے دو لشکروں کا مقابلہ ہوتا ہے، ایک شیطانی گروہ اور دوسرا اس کے ساتھ اس کے مددگار، یعنی عادت کا لشکر اور پھر خصوصاً عادت بھی ایسی چیزوں کی جن کے حاصل کرنے میں سہولت ہو کہ ان میں خرچ کیے بھی ضرورت نہیں، مثلاً: غیبت کرنا، جھوٹ بولنا، جھگڑا اور خود ستائی وغیرہ، کہ ان گناہوں میں صرف زبان چلانی پڑتی ہے، پس ان سے بچنا اور صبر کرنا بڑی بہادری کا کام ہے اور اس پر صبر صدیقین ہی کر سکتے ہیں۔

گناہوں اور معاصی سے بچنے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس (کی خواہشات) کے خلاف جہاد (کوشش کرے) اور مجاہد وہ ہے جو گناہوں کی عادت اور بُری خواہشات کو چھوڑ دے۔ (ترجمہ از مرتب)

روایت ملاحظہ فرمائیں:

”قال النبي صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: المجاهد من جاهد هواه، والمهاجر من هجر السوء.“ (رواه الحاكم في المستدرک: ۱۱۱) بنحوه هنا ضمن خطبة له صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ من حديث سيدنا فضالة رضي الله عنه. حاشية الأربعين في أصول الدين: ۳۷۸)

ایذاؤں پر صبر کرنے کی ضرورت

تیسری قسم: ان چیزوں پر صبر کرنا ہے جو اگرچہ تمہاری اختیاری نہیں ہیں؛ مگر ان کا تدارک اور تلافی تمہارے قبضہ میں ضرور ہے، مثلاً: کسی ایسے شخص سے ایذا پہنچی جس سے تم انتقام لے سکتے ہو؛ مگر اس پر صبر کرو اور انتقام نہ لو یہ صبر کرنا کسی وقت واجب ہے، مکافات کے چھوٹ جانے کی وجہ سے اور کبھی اس پر صبر کرنا مستحب ہے۔

اسی وجہ سے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم فرمایا کرتے تھے کہ ہم میں سے جو تکلیفوں پر صبر نہ کر سکتا تھا ہم اُس کو کامل ایمان والا شمار نہیں کرتے تھے۔ ”ما كنا نعد إيماناً الرجل إيماناً إذا لم يصبر على الأذى“.

(الأربعين في أصول الدين: ۳۷۹. ترجمہ از مرتب)

اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے قول کو قرآن میں ذکر کیا، وہ فرماتے تھے:

﴿وَلْيَصْرِبْنَ عَلَىٰ مَا أُذِيتُمْوْنَا وَعَلَىٰ اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ۝﴾

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَدَعِ أَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَىٰ اللّٰهِ﴾

ارشاد باری ہے:

﴿وَلَقَدْ نَعَلِمُ أَنَّكَ يَصِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ ۝﴾

السَّاجِدِينَ ۝﴾

ان تمام آیتوں میں نبیوں کے تکالیف پر صبر کرنے کو بیان کیا ہے، کہ وہ کس طرح صبر کرتے تھے اور اللہ پر بھروسہ رکھتے تھے؛ لہذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ بھی انبیاء کی طرح صبر کو اپنانے کی کوشش کرے۔ اللہم افقنا بہ۔

(اضافہ از مرتب)

تیسری قسم میں اُن تکالیف پر صبر کرنے کا بیان تھا جو بندوں کی جانب سے پہنچتی ہیں، جن میں بندے کو اختیار ہوتا ہے کہ چاہے تو وہ بدلہ لے اور چاہے تو معاف کر دے اور صبر کرے۔

مصائب اور آفات پر صبر کرنے کی ضرورت

چوتھی قسم: وہ مصائب اور آفات ہیں جو بالکل غیر اختیاری ہوں، یعنی اس کی تلافی بھی اپنے اختیار میں نہ ہو، جیسے: کسی عزیز کے مرجانے یا مال کے برباد ہو جانے کی مصیبت یا کسی مرض و بیماری کا پیدا ہو جانا یا کسی عضو کا جاتے رہنا، غرض تمام بلاؤں اور حوادث پر صبر کرنا چوتھی قسم میں داخل ہے اور اس پر صبر کرنا اللہ کے نزدیک بہت اُونچا مقام دلانے کا ذریعہ و سبب ہے۔

چنانچہ اس کو ثابت کرنے کے لیے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے چند روایتیں ذکر فرمائی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: صبر کا ذکر قرآن کریم میں تین جگہ ہوا ہے: (۱) فرائض کے ادا کرنے میں صبر کرنا اور اس صبر کے لیے تین سو درجے ہیں (۲) اللہ کی نافرمانیوں اور حرام کاموں سے رُکنے میں صبر کرنا اور اس کے لیے چھ سو درجے ہیں (۳) اور مصیبت و بلاؤں پر صبر کرنا، اس کے لیے ۹۰۰ درجے ہیں۔ (الاربعین فی اصول الدین: ۳۸۰)

عربی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

”قال ابن عباس رضي الله عنهما: الصبر في القرآن على ثلاث مقامات: صبر على أداء

الفرائض، دلہ ثلاث مئة درجة، وصبر عن محارم اللہ تعالیٰ ولہ ست مئة درجة، وصبر

في المصيبة عند الصدمة الأولى وله تسع مئة درجة“۔ (الأربعين في أصول الدين: ۳۸۰)

اس روایت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ: (۱) فرائض پر صبر بھی طاعات پر صبر کرنا یعنی اللہ کی فرماں برداری میں جو تکلیف ہوتی ہو اُس کو برداشت کرنا، اس کے لیے تین سو درجے ہیں، جو بندہ اس صبر کو جتنا خوش دلی سے اپناتا ہے اور اس پر پورا اُترتا ہے اسی کے بقدر اللہ کے یہاں سے اُس کو ثواب ملتا ہے۔

(۲) اللہ کی نافرمانی اور معصیت سے صبر کرنا، یعنی اللہ کی نافرمانی کرنے سے رُک جانا، جب کہ نفس کو اس گناہ کی خواہش ہو اور انسان اپنے آپ کو اس سے بچالے، ایسی صورت میں اس کو صبر کے ۶۰۰ درجوں میں سے جس سطح کا اس کا صبر ہوگا اسی کے بقدر اللہ پاک بدلہ اور ثواب عطا فرمائیں گے۔

(۳) مصیبت اور بلاؤں پر صبر۔ یا تو مصیبت بندوں کی جانب سے ہوگی یا اللہ کی جانب سے آئے گی، دونوں صورتوں میں انسان اگر صبر کو تھامے گا اور ہر مصیبت کو اللہ ہی کی جانب سے سمجھ کر اس کو برداشت کر لے گا تو اس صبر کے کل ۹۰۰ درجے ہیں، جو جس مصیبت پر جتنا صبر کرے اللہ کے سامنے حاضر ہوگا اللہ پاک بھی اُسی کے بقدر اس کو ثواب عطا فرمائیں گے۔ (ترجمہ و توضیح از مرتب)

دوسری روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جب میں کسی اپنے بندے کو کسی بلا و مصیبت میں مبتلا کرتا ہوں اور وہ اُس پر صبر کرتا ہے اور اس کی عیادت کرنے والوں کو میری شکایت نہیں کرتا تو میں (اُس بندے کے صبر سے خوش ہو کر) اس کے گوشت کو بہتر گوشت سے اور اُس کے خون کو بہتر خون سے بدل دیتا ہوں (اور اگر میرا ارادہ) اُس کو موت عطا کرنا ہے تو اُس کو (اس حالت) میں صحت دیتا ہوں کہ اُس پر کوئی گناہ باقی نہیں رہتا اور اگر میرا ارادہ اُس کو اپنے پاس بلائے کا ہوتا ہے تو اُس کو میں سیدھے اپنی رحمت میں (اپنی جنت میں) داخل کر دیتا ہوں۔

عربی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

”قال صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قال اللهُ تَعَالَى إِذَا ابْتَلَيْتَ عَبْدِي بِبَلَاءٍ فَصَبِرَ وَلَمْ

يَشْكُنِي إِلَىٰ عَوَادِهِ..... أَبَدَلْتَهُ لَحْمًا مِنْ لَحْمِهِ وَدَمًا خَيْرًا مِنْ دَمِهِ، فَإِنْ أْبْرَأْتَهُ.....

أْبْرَأْتَهُ وَلَا ذَنْبَ لَهُ، وَإِنْ تَوَفَّيْتَهُ فَإِلَىٰ رَحْمَتِي“۔ (رواه الحاكم في المستدرک: ۳۴۸/۱، من

حدیث سیدنا ابي هريرة مرفوعاً، وهو عند مالك في ”الموطأ“: ۹۴۰/۲، عن عطاء بن يسار

مرسلاً، بحواله: حاشية الأربعين في أصول الدين: ۳۸۰) (ترجمہ از مرتب)

دوسری حدیثِ قدسی میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں: جب میں اپنے بندوں میں سے کسی بندے کو مصیبت میں مبتلا کرتا ہوں بدنی مصیبت میں یا مالی مصیبت میں یا اس کی اولاد (میں کسی کو بیمار کر کے یا کسی کو موت دے کر) مصیبت میں مبتلا کرتا ہوں؛ لیکن میرا بندہ اُس مصیبت کو صبرِ جمیل کے ساتھ استقبال کرتا ہے..... تو قیامت کے دن مجھے اس بندے سے حساب لینے کے لیے میزان قائم کرنے یا اس کے لیے دیوان قائم کرنے سے شرم آتی ہے۔ (الاربعین فی اصول الدین: ۳۸۰۔ ترجمہ از مرتب)

”وقال صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اللهِ تَعَالَى: إِذَا وَجَّهْتَ إِلَى عَبْدٍ مِنْ عِبِيدِي مَصِيبَةً فِي بَدَنِهِ أَوْ مَالِهِ أَوْ وَلَدِهِ، ثُمَّ اسْتَقْبَلَ ذَلِكَ بِصَبْرٍ جَمِيلٍ..... إِسْحَبْتِ مِنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَنْ أَنْصِبَ لَهُ مِيزَانًا، وَأَنْشُرَ لَهُ دِيوَانًا.“ (رواه الحاكم الترمذي في نوادر الأصول: ۹۵۶، وابن عدي في الكامل: ۱۰۷/۱، من حديث سيدنا أنسؓ، بحواله حاشية الأربعين في أصول الدين: ۳۸)

ایک اور روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ہر مصیبت پر اُس کے ختم ہونے تک صبر کرنا عبادت ہے۔ (الاربعین فی اصول الدین: ۳۸۱۔ ترجمہ از مرتب)

”وقال صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: انتظر الفرج بالصبر عبادة.“ (رواه القضاعي في سند الشهاب: ۴۲، والبيهقي في الشعب: ۹۵۳۱، من حديث سيدنا عليؓ، بحواله حاشية الأربعين في أصول الدين: ۳۸۱)

اسی طرح ایک اور روایت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ کی بزرگی اور اس کی معرفت کا حق یہ ہے کہ تیرے (مصیبت پر) درد کی شکایت نہ کی جائے اور نہ ہی تیسرے مصیبت کا ذکر کیا جائے۔ (الاربعین فی اصول الدین: ۳۸۱)

”وقال من إجلال الله تعالى ومعرفة حقه..... ألا تشكو وجعلك ولا تذكر مصيبتك.“ (رواه أبو نعيم في الحلية: ۳۸۹/۶ بنحوه مختصوا من كلام سفيان الثوري، بحواله الأربعين)

مطلب یہ ہے کہ اگر آدمی ہر درد کو چھپائے گا اور اپنی ہر مصیبت کو مخفی رکھے گا تب جا کر لوگوں کو بھی اس کی اطلاع نہ ہوگی، اگر انسان اس کے بجائے لوگوں سے شکایت کرتا پھرے گا اور اپنی مصیبت کو لوگوں کے سامنے بیان کرتا پھرے گا پھر لوگ بھی شکایت کریں گے اور مصیبت کا ذکر کریں گے۔ (اضافہ از مرتب)

خلاصہ

آخر میں حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ”الاربعین فی اصول الدین“ میں فرماتے ہیں: اس مضمون سے یہ بات اچھی طرح جان چکے ہیں کہ آپ زندگی کے ہر حال میں صبر کے محتاج ہیں، اسی سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ صبر ایمان کا آدھا حصہ ہے اور ایمان کا دوسرا حصہ دوسرے اعمال سے متعلق ہے، جیسا کہ اس سے پہلے بھی حدیث گزری ہے۔

”قال صلی اللہ علیہ وسلم: الإیمان نصفان: نصف صبر ونصف شکر“.

(رواہ البیہقی فی شعب الإیمان: ۹۲۶۴، من حدیث سیدنا انسؓ، بحوالہ حاشیة الأربعین فی

أصول الدین: ۳۸۱)

(اگلا مضمون ان شاء اللہ شکر پر پیش کیا جائے گا)



استقبالِ رمضان

از قلم: مولوی محمد عمر فاروق فتح پوری، متعلم ندوۃ العلماء لکھنؤ

رمضان کی آمد آمد ہے، جس کے پہلو تئیں للہیت، روحانیت، نفس کشی، نفس فراموشی، صبر و تحمل ماسوا سے بے نیازی و بے تعلقی، اجتماعیت و مواسات، الفت و محبت، ایثار و قربانی جیسے عظیم جذبات پروان چڑھتے ہیں اور اس سے ایک ایسی زندگی وابستہ ہوتی ہے جو آنا و نخت، نمود و نمائش، ریاد بناوٹ، جھوٹ اور ناراستی کے بجائے خلوص و للہیت، تقویٰ و پرہیزگاری، راستی و حق گوئی، عجز و انکساری کا حسین آبیژیل ہوتی ہے، یہ مہینہ قلوب کی نفرتوں اور کدورتوں کو صاف کر کے اُن کی تجدید کرتا ہے، بد مزہ روح کی اصلاح و تزکیہ کر کے اس کے اندر حلاوت و چاشنی اور نور ایمانی پیدا کرتا ہے، اغراضِ نفسانی اور خواہشاتِ باطنی پر قدغن لگاتا ہے، بد بودار معاشرے اور پُر عفونت سماج کو شادابی و خوش رنگی عطا کرتا ہے، اس کی آمد سراپا رحمتوں اور بخششوں کا نزول ہے، ارشادِ نبوی ہے: ”اس کا پہلا عشرہ رحمت کا، دوسرا بخشش کا اور تیسرا جہنم سے خلاصی کا ہے۔“ شرف میں اس ک کوئی ہم پلہ نہیں کہ اس ماہ کی ایک شب میں اوّل اوّل دنیا کے لیے ہدایت نامہ اُتارا گیا ہے، جس نے امتحانات اور ابتلاءات میں پھنسی ہوئی انسانیت کو نہیں راہ دی اور جس نے انسانیت کے ظلمت کدہ کو نورانیت کے بدرِ کامل سے پُر انوار بنایا، مُردہ دلوں میں جان ڈالی، جس نغمہ ازل کی سُریلی آواز سے بے ہوشوں میں بیداری پیدا ہوئی اور خود اس شب کو ﴿كَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ﴾ کا تمغائے امتیاز ملا، جنت کے دروازے اس مہینے میں کھول دیے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں، شیطانوں کو پابہ زنجیر کر دیا جاتا ہے، یہ مہینہ اپنے مسیحی کی مکمل عکاسی کرتا ہے، لفظ رمضان ”رمضا“ سے مشتق ہے، جس کے معنی اُس بارش کے آتے ہیں جو کہ مسم خریف سے پہلے برس کر زمین کو گردوغبار سے پاک کر دیتی ہے، مسلمانوں کے لیے یہ مہینہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت کی بارش کا ہے، جس کے نزول سے مومنوں کے گناہ دُھل جاتے ہیں، یہ مہینہ اپنے مابعد کے مہینوں میں زندگی کے بسر کرنے کا زاویہ حیات پیش کرتا ہے، جس زندگی کا اسلام متقاضی ہے یہ مہینہ اس زندگی کو بناتا ہے، اس مہینے کی سب سے بڑی سوغات روزہ ہے، جو عبادتوں میں افضل تر ہے ”عَلَيْكُمْ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَمِثْلَ لَه“ اس کے جیسی کوئی عبادت نہیں، فائدہ اُخروی و دنیاوی سے جو مالا مال ہے، روزہ جو ارح ظاہری اور قوائے باطنی کی حفاظت میں بڑی تاثیر رکھتا ہے، فاسد مادہ کے جمع ہو جانے سے انسان میں جو خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں یہ اُن سے حفاظت کرتا

ہے، مال کی تطہیر مال کی زکاۃ سے ہوتی ہے، اور بدن کی تطہیر روزہ رکھنے سے ہوتی ہے۔
 قلب کا تزکیہ جمعیت باطنی پر منحصر ہے، پراگندہ خاطر ہی اس کے لیے سخت مضر ہے، جو کھانے کی زائد مقدار،
 لوگوں سے زیادہ میل جول سے پیدا ہوتی ہے، روزہ فرض کر کے اللہ نے اُس کو بھی سہل بنا دیا ہے؛ تاکہ بندہ
 وصول الی اللہ سے محروم نہ رہے اور قلب کا تزکیہ ہو سکے۔ روزہ صحت کو بھی برقرار رکھتا ہے اور تقویٰ اختیار کرنے
 میں بھی بہت معاون ہے، ارشادِ باری ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى
 الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ (اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے جیسا کہ ان لوگوں پر کیے
 گئے تھے جو تم سے پہلے ہوئے، عجب نہیں کہ تم متقی بن جاؤ)۔

گناہ کبیرہ، منازعات و محاصمت، سب و شتم، غیبت و ناراستی اور مکرو فریب جیسے اوصافِ رذیلہ کے لیے
 روزہ ڈھال ہے، ”الصَّوْمُ جُنَّةٌ“ یہ ایسے شخص کے لیے بھی نہایت افادیت کا حامل ہے جو نکاح کا خاست گار ہو؛
 لیکن خارج از استطاعت ہو، ایسے شخص کے لیے روزے کو تریاق قرار دیا گیا ہے۔

رمضان میں روزوں پر اہتمام سے سابقہ گناہوں کی تلافی ہوتی ہے، یہ تو بہت تھوڑے فضائل اور فوائدِ خوف
 طوالت کے سبب بیان کر پایا ہوں، اس جیسے فضائل اور فوائد سے بھرپور اور نہ جانے مزید کتنی سوغات لے کر یہ
 مہینہ قدم رنج فرما ہوتا ہے؛ لہذا ہم کو بھی اس عظیم و جلیل اور متبرک مہینہ کی آمد گراں قدر کے شایانِ شان طمطراق
 کے ساتھ اس کا استقبال اور خیر مقدم کریں۔

غفلت، سستی، کابلی، بے اعتنائی، بے التفاتی، ناقدری، و ناشکری، احسان فراموشی، جیسے اوصافِ رذیلہ
 سے اجتناب کریں، طاعتِ خداوندی، مناجات، آہِ سحر گاہی، تلاوتِ قرآن، صلاۃ و صوم، انفاق فی سبیل اللہ، آہ
 وزاری، شب بیداری، موانست و عنخواری، مسکین اور یتیموں سے ہمدردی کی غم خواری، روزے میں بھوک کی بے
 تابی، جیسی تمام لذت تر لذتوں اور حلاوتوں سے لطف اندوز ہوں، دعاؤں کا بہت اہتمام کریں، خاص طور پر اس
 دعا کا: ”اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي رَجَبٍ وَشَعْبَانَ وَبَلِّغْنَا رَمَضَانَ“۔

جب غرہ رمضان دیکھے تو یہ دعا پڑھیں: ”اللَّهُمَّ أَهْلَهُ عَلَيْنَا بِالْأَمْنِ وَالْإِيمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَالْإِسْلَامِ
 وَرَبِّي وَرَبِّكَ اللَّهُ“۔

اب جس کے دل میں آئے وہی پائے روشنی
 ہم نے تو دل جلا کے سر عام رکھ دیا



طلبہ کرام کے ساتھ نرمی کریں

از قلم: مفتی احمد اللہ ثناء صاحب قاسمی، ناظم دارالعلوم رشیدیہ و صدر دارالافتاء والارشاد حیدرآباد

اساتذہ نائب رسول ہیں، اور طلبہ مہمان رسول ہیں، سوچیے! اگر یہ طلبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیسا سلوک کرتے، یا ہم طالب علم بن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیسا سلوک چاہتے، ساری دنیا جانتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سلوک اپنے شاگردوں کے ساتھ کیسا رہا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے سب سے بہترین مربی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی عورت، بچے یا جانور پر ہاتھ نہیں اٹھایا، اگر اصلاح و تربیت کے وسائل درست طریقے سے اختیار کیے جائیں تو مارنے کی نوبت بہت کم آتی ہے۔ بچے پر مار سے زیادہ مار کا خوف اثر انداز ہوتا ہے، زیادہ مار کھانے والے بچے کے دل سے مار کا خوف نکل جاتا ہے، پھر کوئی اور چیز ان کو غلطی سے نہیں روک پاتی۔ دراصل مارنا تربیت میں آخری تادیبی کارروائی ہے، بچوں کے ساتھ رویہ ایسا ہو کہ ان کے دل میں استاذ کی محبت خوف پر ہمیشہ غالب رہے، اگر خوف محبت پر غالب آجائے تو یہ خوف نفرت میں تبدیل ہو جاتا ہے، اس کے بعد تربیت کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

طلبہ کرام کو مار کر پڑھانا استاذ کا کمال نہیں؛ بلکہ نقص ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان نامی ایک شخص کو بادیہ اور صحراء کے باشندوں کی تعلیم کے لیے بھیجا، جو طالب علم نہیں پڑھتا تھا، ابوسفیان اُس کو مارتے تھے؛ چنانچہ انھوں نے اسی بات پر ایک بچہ اوس بن خالد طائی کو کئی کوڑے مارے اور اس کا انتقال ہو گیا، اس کی ماں نے رونا پیٹنا شروع کیا اور حادثہ کی اطلاع ریث بن زید الخلیل طائی کو کر دی، جس نے ابوسفیان کو قتل کر دیا۔

(خیر القرون کی درس گاہیں: ص ۳۳۸، مؤلفہ: قاضی اطہر مبارکپوری، بحوالہ: امداد السالك: ج ۱، ص ۱۴۳)

سزا کی گنجائش ضرورت کی بنا پر دی ہے، اتنی ہی سزا دینے کی اجازت ہو سکتی ہے جو تعلیم و تربیت میں مفید ہو اور جس سزا سے تعلیم و تربیت سے دوری ہو جائے وہ جائز نہیں ہے ”الضُّرُورَةُ تَتَقَدَّرُ بِقَدْرِ الضَّرُورَةِ“۔

طلبہ کرام کا احترام پہلے اساتذہ کریں:

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک طالب علم مطبخ کے ذمہ دار کی شکایت لایا کہ

طلبہ کو کھانا تقسیم کرتے ہوئے مجھے جلی ہوئی روٹی ملنے پر واپس کر دیا تو ذمہ دار نے کہا: ”کہ جلی اور موٹی سو جھننے لگی، لینا ہو تو لو؛ ورنہ جاؤ، مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ اس کو اپنے حصہ میں لگا لوں، یا جوڑی جلی اُس کا تاوان دیا کروں۔ حضرت (مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری) یہ خبر سنتے ہی مطبخ میں آئے اور غصہ کی وجہ سے آپ کا چہرہ سُرخ ہو گیا، میں ساتھ تھا اور دیکھ رہا تھا کہ حضرت کے بدن اور آواز دونوں میں رعشہ ہے، محرر مطبخ سے آپ نے واقعہ پوچھا، اور جب انہوں نے خود اس توقع پر صحیح صحیح بیان کر دیا کہ طلبہ کا نظام قائم رکھنے کے لیے محرر کی طرف داری کی جائے تو اس وقت آپ نے فرمایا کہ: منشی جی سنو! مدرسہ انہیں پر دیسی بے وطن مسکین طلبہ کے دم سے قائم ہے اور تم اور میں انہیں کے طفیل روٹیاں کھا رہے ہیں، اگر یہ نہ ہوں تو نہ مطبخ کی ضرورت ہے نہ تمہاری حاجت، مدرسین بھی فارغ اور مدرسہ بھی خالی، یہ مسکین سہی بھتاج سہی؛ مگر مجھے اور تمہیں دونوں کو روٹیاں دے رہے ہیں، مجھے صرف یہ بتا دو کہ تمہیں ترش کلام کرنے کا حق کیا تھا؟ اور تم کون تھے یہ کہنے والے کہ ”خنہ بہک“ گئے ہیں، ان کا باپ بنا ہوا بھی زندہ ہوں، تم کو تو مطبخ سے جزو و نحوہ بنا کر دو حواریک ملتی ہے، آخر کیا وجہ تھی کہ جلی ہوئی روٹی تم اپنی خوراک میں نہ لگا سکتے؟ اور مہمان رسول کو مجبور کیا کہ یا تو یہی جلی ہوئی کھائے؛ ورنہ فاقہ کرے، اب تو اپنی خوراک اس کے حوالے کر دو اور آئندہ سے خوب کان کھول کر سن لو کہ کسی طالب علم کے ساتھ کچھ بھی تیز یا ترش برتاؤ کیا تو کان پکڑ کر مطبخ سے نکال دوں گا، ہاں کسی طالب علم سے کوئی غلطی ہو تو مجھ سے کہو، میں تحقیق کے بعد جو سزا مناسب سمجھوں گا، دوں گا؛ مگر دوسرے کو نہ دیکھ سکوں گا کہ وہ انہیں ترچھی نظروں سے بھی دیکھے؛ چوں کہ پہلی غلطی ہے؛ اس لیے اس وقت تنبیہ پر اکتبا کرت ہوں، آئندہ اس کا پورا لحاظ رکھا جائے۔

(ارواحِ ثلاثہ: ص ۱۱۳)

حضرت مولانا سحبان محمود صاحب استاذ مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی درس گاہ میں کسی طالب علم کے نام معقول سوال پر طلبہ ہنس پڑے تو خفگی سے بچانے کے لیے خود سوال کی وضاحت فرما کر معقول بناتے، پھر اس کا جواب دیتے، مہمانانِ رسول کی عظمت کرنا پہلے اساتذہ پر عائد ہوتا ہے۔

حضرت شیخ الہند کی طلبہ کرام سے شفقت کا عالم:

حضرت شیخ الہند حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد جمعرات کا گھنٹہ ختم ہونے کے بعد گنگوہ جو دیوبند سے ۳۰ میل کے فاصلہ پر ہے پیدل چل دیتے، جمعہ کا پورا دن گنگوہ ہی کی خدمت میں گزار آتے، برسہا برس یہ معمول رہا، ایک بار مولانا محمود صاحب اور دو شاگردوں نے بھی ہم راہی کا ارادہ ظاہر کیا، آپ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک تاگلہ کراہی کروا کر باری باری طلبہ کو بٹھایا اور گنگوہ تک خود ایک چٹی لے کر ٹھونکانے کا فریضہ

انجام دیتے رہے، طلبہ مجبوراً حکم کی تعمیل میں سواری رہے، گنگوہ پہنچنے پر طلبہ کو احساس ہوا کہ تا نگہ ہمارے لیے تھانہ حضرت کے لیے، واپسی پر تینوں نے مشورہ کیا کہ ایک بار حضرت کو سواری کروادیں، پھر دیوبند تک اترنے نہ دیں گے، واپسی پر کسی طرح حضرت کو سواری کروادیا، مولانا محمود صاحب نے ”حاجی صاحب، حافظ ضامن شہید، نانوتوی“ کا تذکرہ چھیڑ دیا، آپ کی عادت تھی کہ اکابر کے تذکرہ پر ادھر ادھر کا خیال بھی نہ رہتا، پورے ۲۶ منیل واقعات میں گزر گئے، دیوبند سے چار میل فاصلہ پر تھے کہ ندی پر جب نظر پڑی تو گھبرا کر فرمایا: اوہ! ندی آگئی، یہ کہہ کر ٹٹوسے کود پڑے اور پھر طلبہ کو باری باری سواری کروا کر ہاتھ میں چتی لیے شان بے نفسی اور شفقت سے دیوبند میں داخل ہوئے، بالآخر طلبہ جس سے بچنا چاہتے تھے وہی بات ہو کر رہی۔ (مجالس علم و ذکر: ۱۷۳)

طلبہ سے معافی مانگنا:

حضرت مولانا سبحان محمود صاحب استاذ مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کا معمول تھا کہ ختم بخاری شریف کے موقع پر آخری نصیحت کرتے ہوئے جب گریہ تاری ہو جاتا تو فرماتے: میں اگر چہ عمر میں آپ سے بڑا ہوں؛ لیکن مرتبہ میں چھوٹا ہوں، آپ طالب علم ہیں، میں تو دنیا دار آدمی ہوں، بہت زیادہ احتیاط کے بعد بھی انسان و بشر ہوں، تو حطا ہو جاتی ہے، سب سے پہلے کھلے دل سے عرض کرتا ہوں کہ: ”میری غلطیوں کو معاف کر دینا، اللہ تعالیٰ بھی معاف فرمائیں گے، اور آپ کی جانب سے جو غلطیاں میرے حق میں ہوئی ہیں میں نے بھی کھلے دل سے معاف کر دیا، حضرات! سبک دوشی حاصل کر لو، اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے اپنے آپ کو پاک و صاف کر لو، اعتدال پر قائم رہو اختلاف میں بھی، مسلک میں بھی۔ (اہل علم کی زندگی: ۲۳۰)

شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزئی جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن میں وفاق المدارس کے سالانہ امتحان میں نگران اعلیٰ مقرر ہوئے، دوران امتحان ایک طالب علم امتحان ہال میں کچھ پوچھنے کے لیے اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا، جب تک کہ کوئی استاذ اُس تک پہنچتے اُس نے کھڑے کھڑے دوسرے طالب علم سے باتیں شروع کر دیں، امتحان گاہ میں بات کرنا سخت جرم ہے، آپ رحمۃ اللہ علیہ کو اس حرکت پر غصہ آیا اور ایک چپت رسید کر دیا، جس سے طالب علم گر پڑا، پھر اُس کا اشکال حل فرمایا، امتحان ختم ہونے کے بعد جب طلبہ جانے لگے تو اس طالب علم کو بلوا کر اس سے معافی مانگی، اس خوف سے کہ کہیں ضرب کی شدت غلطی کی شدت سے نہ بڑھ گئی ہو۔ اللہ اکبر! اکابرین میں کیا خوفِ آخرت تھا کہ ضرب اور غلطی کی کیفیت و کمیت کا بھی موازنہ کرتے تھے۔

(اخبار المدارس، خصوصی نمبر: ۳۸۷)

بے جا پٹائی پر استاذ کی تنبیہ کرنا:

مولانا فضل حق صاحب کو جو ”ہدیہ سعیدیہ“ کے مصنف اور زبردست عالم ہیں، آپ رحمۃ اللہ علیہ کے والد مولانا فضل امام صاحب منطق کی مشہور کتاب ”مرقات“ کے مصنف ہیں، ایک مرتبہ ایک طالب علم سے فرمایا کہ: فضل حق سے سبق پڑھ لو! طالب علم غریب، بد صورت، کم علم و کند ذہن اور بڑی عمر کا تھا، جب کہ مولانا فضل حق نازک طبع، ناز پروردہ نوافرغ وئی فضیلت و ذہنی جودت تھی، تھوڑی دیر سبق پڑھانے کے بعد صحبت راس نہ آئی، جھٹ سے کتاب پھینک دی، بُرا بھلا کہہ کر نکال دیا، طالب علم نے روتے ہوئے والد محترم مولانا فضل امام صاحب سے شکایت کر دی، مولانا نے فرمایا: بلاؤ اُس خبیث کو! مولوی فضل حق صاحب حاضر ہو کر دست بستہ کھڑے ہو گئے، مولانا نے ایسے زور سے ایک تھپڑ رسید کیا کہ فرزند کی دستارِ فضیلت دُور جا پڑی، فرمانے لگے: ظالم! عمر بھر بسم اللہ کے گنبد میں رہا، ناز و نعمت میں پرورش پائی، جس کے سامنے کتاب رکھی اُس نے خاطر داری سے تمہیں پڑھایا، طالب علم کی قدر و منزلت تم کیا جانو، اگر مسافر کرتا، بھیک مانگتا، پھر طالب علم بنتا تو حقیقت معلوم ہوتی۔ (منصب تدریس اور حضرات مدرسین: ۷۹)

طلبہ سے ناراضگی کو طول نہ دیں:

امام سفیان ابن عیینہ ایک مرتبہ کسی بات پر طلبہ سے ناراض ہو گئے اور فرمایا: میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ ایک ماہ تک درس نہ دوں، یہ سن کر ایک نوجوان طالب علم نے عرض کیا: اے ابو محمد! آپ نرمی فرمائیے اور اچھی بات کیجیے، اپنے اسلاف کی پیروی کیجیے، اپنے لقمہ نشینوں کے ساتھ اچھا سلوک کیجیے؛ کیوں کہ آپ بقیۃ السلف ہیں، اللہ اور اُس کے رسول کے علم کے امین اور ذمہ دار ہیں۔ ”یا ابا محمد! اَلنَّ جَانِبِکَ وَ حَسِّنْ قَوْلِکَ وَ تَسَّ بِصَالِحِی سَلْفِکَ وَ اَجْمَلْ مَجَالِسَہٗ جَلَسَاتِکَ فَقْ اَصْبَحْتَ بَقِیَۃَ النَّاسِ وَ اَمِیْنَا لِلّٰہِ وَ رَسُوْلَہٗ عَلٰی الْعِلْمِ“ امام ابن عیینہ نے جب طالب علم سے یہ بات سنی تو نرم پڑ گئے اور رقت طاری ہو گئی، بہت روئے اور یہ شعر پڑھا:

خَلَّتِ الدِّیَارُ فِسْدَتَ غَیْرِ مَسُوْدٍ

وَ مِّنَ الْبَلَاءِ تَفَرَّدِیْ بِالْمَسُوْدِ

”بستیاں خالی ہو گئیں تو میں بغیر سردار بنائے سردار بن گیا اور تنہا میری سرداری میرے لیے بڑی آزمائش ہے۔“

پھر تمام طلبہ کو پڑھانا شروع کر دیا اور وہ سب آپ کی درس گاہ سے پورے طور پر فیضیاب ہو کر واپس ہوئے۔
(مقدمۃ الحق للشیخ عبدالقادر مغربی)

قاری صدیق صاحب کا طلبہ کے کپڑے اور بیت الخلا صاف کرنا:

قاری صدیق صاحب طلبہ سے فرماتے: ”تم ٹھیک سے رہو تو میں تمہارا سب کچھ کرنے کو تیار ہوں، پاخانہ اٹھانے اور دھونے کو تیار ہوں،“ اور عملاً کرتے بھی تھے۔ ایک مرتبہ رات میں لنگی اور بنیان پہن کر مدرسہ کے بیت الخلا کی صفائی میں مصروف ہو گئے، پورے بیت الخلا صاف کر کے کنویں کے پاس نہا کر کپڑے بدلے اور تہجد میں مصروف ہو گئے، حتیٰ کہ جس دن صبح بیت الخلا صاف ماتیں تو طلبہ واساتذہ سمجھ جاتے کہ حضرت کی تواضع کا کرشمہ ہے۔ جب تک فلش بیت الخلا نہیں بنے اور مستقل خادم نہیں رکھا گیا اُس وقت تک یہی معمول رہا۔
مدرسہ کے ابتدائی دور میں طلبہ کے ساتھ تالاب پر کپڑے دھونے کے لیے تشریف لے جاتے، سب اپنے اپنے کپڑے دھوتے، آپ اپنے کپڑوں سے فارغ ہو کر طلبہ کے کپڑوں میں مدد فرماتے۔

طلبہ کی غلاظت صاف کرنے کا واقعہ:

مجاہد ملت حضرت مولانا عبداللطیف صاحب جہلمی خلیفہ مفسر قرآن حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ طلبہ سے فرماتے: اے عزیز طلبہ! تم اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان ہو، ہمارا جی چاہتا ہے کہ تمہارے کمروں میں خود صفائی کریں، تمہارے برتن دھوئیں؛ لیکن مدرسہ کی دوسری ذمہ داریاں اور مصروفیات رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ ایک مرتبہ دفتر کے سامنے کسی طالب علم نے پاخانہ کر دیا، پوچھا: کس نے کیا؟ مدرسہ کے ناظم صاحب نے کہا: کسی طالب علم نے کیا ہے، فرمایا: اب تک صاف کیوں نہیں ہوا؟ بھنگی آئے گا تو صاف ہو جائے گا، غصہ سے فرمایا: لاؤ میں خود اٹھا دیتا ہوں، تمہیں کیا معلوم طلبہ کا کیا مقام ہے، یہ وہ ہیں جن کے پیر کے نیچے فرشتے نورانی پر بچھاتے ہیں۔

ایک مرتبہ مہمانوں کے لیے کھانا ختم ہو چکا تھا، فرمایا: طلبہ کی بچی ہوئی روٹی کے ٹکڑے لائیں، خادم کچھ ہچکچایا، تو فرمانے لگے: طلبہ کے روٹی کے ٹکڑوں کی عظمت شاہی دسترخوانوں سے بڑی ہے اور خود بھی کئی دفعہ طلبہ کی بچی ہوئی روٹی کے ٹکڑوں پر گزارا فرماتے۔ (ماہنامہ ”حق چاریا“، خصوصی نمبر: ۱۵۹)

(اگر ہمارے اسلاف اس طرح تحمل اور نرمی سے کام نہ کرتے تو علم دین ہم تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا تھا، اصل بات یہ ہے کہ اُن کے اندر علم دین کی خدمت کا جذبہ تھا؛ اس لیے سب کچھ برداشت کرتے تھے، ہمارے دل اس سے خالی ہیں۔“

کیا سختی مقصود بالذات ہے؟

سختی مقصود بالذات نہیں، مقصود اصلاح ہے، جب معلوم ہو جائے کہ سختی سے نفع نہیں ہوتا تو نرمی سے اصلاح کرتے رہیں۔ جس شریک کو بار بار پیٹا جائے، اُٹھتے بیٹھتے لات جوتے کا معاملہ رکھا جائے وہ بے حیا ہو جاتا ہے، پھر سپینے سے اُس پر کچھ اثر نہیں ہوتا، اُس وقت یہ مرض لاعلاج ہو جاتا ہے اور ساری عمر کے لیے ایک بُری عادت، یعنی بے حیائی اُس کی طبیعت میں داخل ہو جاتی ہے۔

حجاز و مغرب میں مارنے کا عمل کیوں رائج نہیں ہے؟

اکثر مغربی ممالک نے تو بچوں کی اسکول یا گھر میں پٹائی کو ایک جرم قرار دے رکھا ہے اور خلاف ورزی کرنے والوں کو اچھی خاصی سزا ہو سکتی ہے۔ نظام تعلیم کا ہی فرق ہے کہ ملک میں اچھے اور تا بعد از محنت کش پیدا ہوتے ہیں، جب کہ مغربی ممالک میں موجود اور سائنس دان پیدا ہو رہے ہیں۔ اگر بچوں کو جسمانی سزا دے کر تعلیم یافتہ بنایا جاسکتا تو ہر قوم نے ”آئسن ٹائین“ اور ”ہیل گیٹس“ پیدا کیے ہوتے؛ مگر مغرب کی طرح آزادی دینے سے بچے خراب بھی ہو جاتے ہیں، زیادہ چینی شوگر کا مریض بھی بنا سکتی ہے؛ چنانچہ مغرب میں اکثر بچے انتہائی کاہل اور باغی ہوتے ہیں اور اُن کے دل میں چھوٹے بڑے کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔ امریکہ جیسے ممالک میں بچے اپنے ہی ہم جماعتوں کو گولیوں سے بھون رہے ہیں، جو اسی غلط تربیت اور بے جا ڈھیل کا نتیجہ ہے۔

ترقی یافتہ ملک جاپان میں ہر سطح پر ایک مستقل تربیتی پروگرام رکھا جاتا ہے، ہر شعبے میں ایسے ماہرین پختے جاتے ہیں جن کا کام ہی مہینے میں ایک بار نئے تقاضوں کے مطابق اساتذہ اور مختلف شعبوں سے وابستہ افراد کی ٹریننگ کرانا ہوتا ہے۔

سعودیہ یا عرب ممالک میں ایسی سزا دیکھنے میں نہیں آتی ہیں جو ایشیائی ممالک میں بکثرت پائی جاتی ہیں، یہاں تو مارنا جرم ہے، ہمارے یہاں ایک بچہ مار پیٹ سے تین سے پانچ سال میں قرآن حفظ کرتا ہے، جب کہ سعودیہ میں مار پیٹ کے بغیر دو سے تین سال میں حفظ کر لیتا ہے، جب کہ ان کا حفظ و لہجہ دونوں معیاری ہوتے ہیں۔

بوقتِ ضرورت مارنے کی گنجائش تو ہے؛ مگر.....:

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ”صحیح بخاری“ میں باب قائم کیا ہے: ”باب التوثق ممن تخشى معرفته“ (جس سے فساد کا خطرہ ہو اُس کو باندھنا) اور اس کے تحت ذکر کیا ہے کہ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما حضرت عکرمہ گو فرانس، سنن اور تعلیم قرآن کے لیے باندھا کرتے تھے ”وقید ابن عباس عکرمة“

علیٰ تعلیم القرآن، والسنن والفرائض، طبقات کبریٰ میں ہے کہ حضرت عمر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ابن عباس قرآن وسنت کی تعلیم کے لیے میرے پاؤں میں بیڑی ڈالا کرتے تھے ”کان ابن عباس يجعل في رجلي الكبل يعلمني القرآن ويعلمني السنة“۔ (الطبقات الکبریٰ لابن سعد: ۲۱۹/۵، بقية الطبقة الثامنة من التابعين، عكرمة، ط: دارالکتب العلمیة، بیروت) معلوم ہوا کہ سرپرست حضرات اور اساتذہ کے لیے بچوں کو تادیب اور تنبیہ کی غرض سے مناسب سزا دینا جائز ہے۔ اکثر بچوں کو گھر سے تربیت نہیں ملتی، گھر والے سب کچھ مولانا صاحب یا مولوی صاحب کے سپرد کر دیتے ہیں اور اپنی ذمہ داریوں سے بے توجہی برتتے ہیں، جس سے تنبیہ کی ضرورت پیش آنا معقول ہے؛ مگر اب نہ وہ سرپرست رہے جو اپنے لعلوں کو استاذ کے سپرد یہ عرض کرتے ہوئے کر دیں کہ: ”ہڈی ہماری اور گوشت آپ کا“ اور نہ ہی وہ طلبہ رہے کہ استاذ کی خاطر اپنی انگلی کاٹ کر دے دیں اور اب وہ اساتذہ بھی کالعدم ہو گئے جو ذمہ دار و حساس اور بے لوث خدمت گار تھے، جس کے سبب بچے بے حس و غیر ذمہ دار ہوتے جا رہے ہیں اور اساتذہ بے دلی سے اپنی ڈیوٹی نبھا رہے ہیں۔

کبھی بھی طالب علم استاذ کے غصہ جھاڑنے اور صرف مارنے پیٹنے سے کامیاب نہیں ہو سکتا؛ بلکہ اسلاف نے اگر طلبہ کو کبھی سزا دی بھی ہے تو صرف ان کے مادہ حساسیت کو بڑھانے کے لیے، ان کو اپنی ذمہ داری کا احساس دلانے کے لیے۔

طلبہ کرام کے لیے رونے والے اساتذہ کہاں ہیں؟

حضرت قاری رحیم بخش رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کے ایک بے تکلف ہم عمر ساتھی نے پوچھ لیا کہ: ”قاری صاحب! کیا وجہ ہے کہ آپ کے یہاں داخلہ کا ہجوم رہتا ہے؟ قرعہ اندازی کی جاتی، دو تین سال تک طلبہ قرعہ میں نام کے لیے انتظار کرتے ہیں، جب کہ نہ کوئی رعایت ہوتی ہے؛ بلکہ سختی اور پٹائی بھی مشہور ہے، دوسرا کوئی سختی کرتا تو سب طلبہ بھاگ جاتے ہیں، یہاں طلبہ روتے رہتے ہیں؛ مگر بھاگنے کا نام نہیں لیتے، آخر کیا راز ہے؟“ فرمایا: تم کو دن میں ڈنڈے کے خوف سے طلبہ کو بھاگے بغیر روتا دیکھ کر تعجب ہوتا ہے، اگر تم رات کو مجھے طلبہ کے حق میں روتا دیکھ لیتے تو نہ کبھی تعجب کرتے اور نہ ایسا سول کرتے۔

ایک مرتبہ منزل سنا تے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر فرمایا: تم طلبہ کتنے مزے میں ہو کہ تمہیں صرف اپنی فکر ہے اور میرے کندھے پر پینٹھ (۶۵) طلبہ کا بوجھ ہے، اللہ کی قسم! بعض اوقات پوری رات جاگتے ہوئے بے چینی میں گزرتی ہے، کروٹیں بدلتا رہتا ہوں؛ مگر نیند نہیں آتی، کہ فلاں بچے کو منزل یاد نہیں، فلاں کی تجوید درست نہیں، فلاں کے اندر اخلاقی کمزوری ہے، فکر مندی میں تہجد کا وقت ہو جاتا ہے۔ (عشاق قرآن کے واقعات: ۱۹۰)

مارنا نفسیاتی طور پر بہت نقصان دہ ہے:

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بچوں کی تعلیم کے لیے انہیں مارنا ضروری ہے؟ کیا سختی کے ذریعے بہتر طالب علم پیدا کیے جاسکتے ہیں؟ کیا مارنا ڈسپلن کے لیے ضروری ہے؟ تو سنیں! مار پیٹ دراصل اپنی ذمہ داریوں سے فرار کا آسان ترین طریقہ ہے، بچوں کی تربیت اور نشوونما کوئی آسان کام نہیں ہے، جدید تعلیمی نفسیات کی تحقیق ہے کہ جسمانی سزا طلبہ کے تعلیمی عمل پر بُرا اثر ڈالتی ہے، سزا طلب علم کی عزت نفس اور خودداری مجروح کرتی ہے، استاذ کے خلاف نفرت پیدا کرتی ہے، مار پیٹ کے نتیجے میں طلبہ اپنے ہی اساتذہ کو گالیاں بھی دینے لگتے ہیں۔

مارنے کے نقصانات:

ابن خلدون فرماتے ہیں: خوب یاد رکھیے! تعلیم کے سلسلے میں بے جا مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ مضر ہے، خصوصاً چھوٹے بچوں کے حق میں؛ کیوں کہ یہ استاذ کی نااہلی اور غلط تربیت کی نشانی ہے۔ جن کی نشوونما ڈانٹ ڈپٹ اور قہر و تشدد سے ہوتی ہے، ان کے دل و دماغ پر استاذ کا قہر ہی چھایا ہوتا ہے۔ طلبہ کی طبیعت بچھ کر رہ جاتی ہے، اُمنگ و حوصلہ پست ہو جاتا ہے، شوق و دلچسپی جاتی رہتی ہے اور طبیعت میں مستی پیدا ہو جاتی ہے؛ بلکہ بعض اوقات تو دماغ معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ تشدد سے جھوٹ اور بد باطنی پیدا ہوتی ہے اور خودداری سلب ہو جاتی ہے، گویا جبر و تشدد بچوں کو مکرو و فریب اور دغا بازی کی تعلیم دیتا ہے۔ (مقدمہ ابن خلدون، حصہ: ۳۶۵/۲)

امام غزالی فرماتے ہیں: سزا کھلے عام اور طول دینے سے پرہیز کریں، اس سے طالب علم اور استاذ کے درمیان احترام کا پردہ ہٹ جاتا ہے۔ (احیاء العلوم: ۳۷۳/۱)

مدارس میں بچوں کو دی جانے والی سزا کا مقصد نصاب مکمل کرانا تھا۔ اس مسئلے کو مغربی ذرائع ابلاغ نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے؛ کیوں کہ وہ مسلم نظام تعلیم کے پیچھے تشدد اور شدت پسندی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ سرکاری اسکولوں میں چھڑی و ڈنڈا کا استعمال ہوتا ہے، جب کہ پرائیویٹ اسکولوں میں ڈنڈا کا استعمال نہیں ہوتا؛ کیوں کہ وہ بھاری فیس ادا کرتے ہیں، اس کے باوجود بھی عصری درس گاہوں میں آئے دن خودکشی کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، کہ استاذ کی طرف سے ذہنی دباؤ کو طالب علم برداشت نہ کر سکا اور جان دے دی۔

استاذ سے مار کھانے کی کوئی فضیلت نہیں ہے:

یہ بات کہ ”استاذ کی مار جسم کے جس حصے پر لگے اُس پر جہنم کی آگ حرام ہو جاتی ہے“ موضوع اور من گھڑت ہے، اپنی سختی کے لیے موضوعات کا سہارا لینا گناہ کبیرہ ہے۔

مسئلہ سختی کا نہیں؛ بلکہ تربیت کی کمی کا ہے:

مسئلہ تربیت کی کمی کا ہے۔ ایسے اساتذہ خود ان مراحل سے گزر رہے ہوتے ہیں، جس سے یہ ذہن بن جاتا ہے کہ تعلیم کے لیے سختی ضروری ہے، جب کہ یہ کمال نہیں ہے کہ ”ہم جیسے پڑھے ہیں ویسے ہی پڑھائیں“؛ بلکہ کمال یہ ہے کہ: ”جیسے پڑھانا چاہیے ویسے پڑھائیں“، نوج تعلیم اجتہادی امر ہے نہ کہ منصوص، کئی طلبہ دوسروں کی مار پیٹ دیکھ کر ڈر کی وجہ سے مدرسہ سے بھاگ جاتے ہیں۔

طالب علم کو بچانے کے لیے اپنی اکلوتی اولاد کی قربانی دے دی:

[راقم الحروف (قاری صدیق صاحبؒ) نے حضرت استاذی مفتی محمود حسن صاحبؒ سے سنا ہے کہ کاندھلہ میں ایک صاحب کو اُن کے استاذ نے پڑھانے کے لیے بھیجا اور ہدایت کر دی کہ وہاں کسی سے کسی قسم کا سوال نہ کرنا، اللہ کے واسطے پڑھانا، تمہارے مقدر کا جو کچھ ہوگا ملتا رہے گا؛ چنانچہ اُن کی ہدایت کے مطابق ایک مسجد میں اُنہوں نے کام شروع کر دیا، کچھ دن بعد مسجد والوں نے اُن کو ستانا شروع کر دیا، اور کہا: تم مسجد میں تعلیم نہیں دے سکتے۔ اُنہوں نے فرمایا: بھائیوں لو! امامت مجھے نہیں چاہیے، تمہارا کھانا مجھے نہیں چاہیے، تنخواہ تم سے مانگتا نہیں، تم مسجد نکالتے ہو، میں کس درخت کے نیچے جا کر لڑکوں کو پڑھاؤں گا اور اگر تم چاہو کہ بستی چھوڑ دوں یہ ہرگز نہ ہوگا؛ کیوں کہ نے بٹھایا اُس نے تاکید کر دی ہے کہ وہاں سے نکلنا نہیں، انہیں کا قصہ ہے کہ ایک شاگرد بھاگ گیا، اس کی تلاش میں نکلے، معلوم ہوا کہ وہاں سے ملتان چلا گیا ہے، وہاں کا سفر کیا اور اُس کو لا کر پڑھایا، آخر میں بستی والوں کو اپنی غلطی محسوس ہوئی معافی مانگی اور کہا کہ آپ مسجد میں چل کر تعلیم دیں، فرمایا: بہت اچھا! جب نکالا تھا وہاں سے ہم نکل آئے اور جب بلا تے ہو تو ہم چلتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں، اُس علاقے میں اُن سے بہت فیض پہنچا، حضرت جی مولانا الیاسؒ نے بھی اُن کی شادی کر دی ہے، جن کے فیض سے دنیا سیراب ہو رہی ہے۔]



امام المغازی ابو عبد اللہ محمد بن عمر واقدی اور ان کی سخاوت

از قلم: مفتی عبداللطیف صاحب قاسمی، استاذ مدرسہ عربیہ غیث الہدیٰ بنگلور

ابو عبد اللہ محمد بن عمر بن واقد سلمیٰ مغازی، سیرت اور ان سے متعلقہ احکام و تفصیلات کے ماہر اور صاحب تصانیف ہیں، ۱۲۰ ہجری میں ان کی ولادت ہوئی، صغارتاً بعین سے علم حاصل کیا ہے، خلیفہ مامون کی طرف سے عہدہ قضا پر فائز رہے، بڑے فیاض و سخی تھے، ۲۰۷ ہجری میں ان کی وفات ہوئی۔
واقدی فرماتے ہیں:

بادشاہ وقت کی طرف سے میرے پاس چھ لاکھ روپیے بطور نذرانہ آئے؛ لیکن اس میں زکاہ واجب نہیں ہوئی، یعنی زکاہ واجب ہونے سے پہلے ہی وہ رقم خیرات میں خرچ ہو گئی، جب واقدی کا انتقال ہوا، تو وہ عہدہ قضا پر فائز تھے، اس کے باوجود ان کے پاس کفن کے لیے کپڑے بھی میسر نہیں تھے؛ اس لیے کہ جو پیسہ کہیں سے آتا، فقراء و غرباء پر خرچ ہو جاتا؛ اس لیے خلیفہ مامون نے کفن روانہ کیا، مامون کا بھیجا ہوا کفن انہیں پہنایا گیا۔

ان سب امور کے باوجود ان کی باتوں اور کتابوں میں رطب و یابس جمع ہو گئیں، جس کی وجہ سے محدثین کے نزدیک بالالتفاق ضعیف ہیں۔ (سیر اعلام النبلاء، ترجمہ: ۱۳۸۵، ۹، ۱۵۷ تا ۱۶۶)

ابوزید عبدالرحمن بن حاتم مرادی کہتے ہیں:

مصر کے قاضی ہارون بن عبداللہ زہری نے دو سو چھبیس ۲۲۶ھ میں بیان فرمایا: محمد بن عمر واقدی نے خلیفہ مامون کے پاس ایک خط لکھا جس میں قرض کی زیادتی، قرض کا بوجھ، بے صبری اور بے قراری کا تذکرہ کیا تھا، مامون نے اُس خط کی پشت پر لکھا:

تم ایک ایسے آدمی ہو جس میں دو خاص صفتیں پائی جاتی ہیں، پہلی صفت: سخاوت، دوسری صفت: حیا۔
سخاوت نے جو کچھ تمہارے پاس تھا سب کو خرچ کر دیا، صفتِ حیا نے تمہاری پریشانی کو ہم تک پہنچانے سے تمہیں روک دیا، ہم نے تمہارے لیے اتنے اتنے (درہم کی ایک بڑی مقدار دیے جانے) کا حکم دے دیا ہے، اگر تمہاری ضرورت، ارادہ اور خواہش کے موافق ہم نے آپ کو ہدیہ بھیجا ہے، تو اپنی سخاوت میں مزید وسعت پیدا کیجیے اور ہاتھ پھیلا کر دیجیے، اللہ تعالیٰ کے خزانے کھلے ہوئے ہیں، اگر تمہاری خواہش اور ضرورت کے بقدر ہم نے نہیں دیا،

تو تمہاری غلطی (اخفائے حال) کی وجہ سے تمہاری مطلوبہ مقدار ادا نہیں ہو سکی ہے، (اس میں ہمارا قصور نہیں ہے)۔ جب آپ ہارون رشید کی طرف سے عہدہ قضا پر مامور تھے، اُس وقت آپ نے محمد بن اسحاق عن انس کے واسطے سے حدیث سنائی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

”یا زبیر! إن مفاتيح الرزق بإزاء العرش، وقال المصري: إن باب الرزق مفتوح بإزاء العرش وقالا جميعا: ينزل الله تعالى للعباد، أو إلى العباد أرزاقهم على قدر نفقاتهم، فمن قلة، قلة له، ومن كثر، كثر له. (أخرجہ الدارقطني وفي إسناده الواقدي عن محمد بن إسحاق عن الزهري بالعنعنة ولا يصح: المعنى عن حمل الاسفار، تخريج أحاديث الإحياء، كتاب الذم والبخل: ۱)

”اے زبیر! رزق کی کنجیاں عرش کے مقابل (سامنے) میں ہیں۔ ایک دوسری روایت میں ہے: رزق کا دروازہ عرش کے مقابل میں کھلا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ بندوں کی جانب اُن کے خرچ کرنے کے بقدر اُن کا رزق نازل فرماتے ہیں، جو شخص (اہل و عیال، رشتہ دار، محتاج، مسکین، ضرورت اور دیگر دینی و رفاہی امور میں) کم خرچ کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اُس کے لیے رزق کم نازل فرماتے ہیں اور جو شخص زیادہ خرچ کرتا ہے، اُس کے لیے زیادہ رزق کا فیصلہ فرماتے ہیں اور زیادہ رزق نازل فرماتے ہیں۔“
محمد بن عمرو اقدی فرماتے ہیں:

مذکورہ حدیث بیان کرنے کے بعد میں اس کو بھول گیا تھا، مامون کے عطیے اور ہدیے سے زیادہ اس حدیث کی یاد دہانی مجھے اچھی لگی۔

واقعے کے راوی قاضی ہارون بن عبد اللہ فرماتے ہیں: مجھے معلوم ہوا کہ ہدیے کی مقدار ایک لاکھ درہم تھی، گویا اقدی کو ایک بھولی ہوئی حدیث کا یاد آجانا ایک لاکھ درہم کے ہدیے سے زیادہ محبوب ہے۔

(تاریخ دمشق لابن عساکر، ترجمہ محمد بن عمرو اقدی: ۶۸۵۰، تاریخ بغداد، سیرة المامون)

عبرت و نصیحت:

محمد بن عمرو اقدی اس قدر سخی و فیاض تھے کہ اُن کی سخاوت کی وجہ سے اُن کے اس جو کچھ تھا، وہ سب ضرورت مندوں کو دے دیا، اپنا مال ختم ہو گیا، تو لوگوں سے قرضے لے کر ضرورت مندوں پر خرچ کیا ہے، لوگوں کی حوائج اور ضروریات کی تکمیل اُن کے نزدیک اہم تھی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوا کہ نیک کاموں میں خرچ کرنے سے اللہ مال میں اضافہ

عطا فرماتے ہیں، نیک کاموں کے اندر مال خرچ کرنے میں جو بخل سے کام لینے والے ہوتے ہیں، اللہ کی طرف سے اُن کے لیے عطا و بخشش کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے۔

محمد بن عمرو اقدی کے نزدیک حدیث کا مقام و مرتبہ بہت بلند تھا، اُن کے نزدیک حدیث کی اہمیت تھی، درہم و دینار کی کوئی حیثیت اُن کے نزدیک نہیں تھی، ایک بھولی ہوئی حدیث کا یاد آجانا انہیں ایک لاکھ درہم سے زیادہ قیمتی و محبوب تھا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث کا حکم:

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت کو اقدی کی وجہ سے نہایت ضعیف قرار دیا گیا ہے؛ اس لیے کہ واقدی روایت حدیث میں ضعیف ہیں؛ لیکن مذکورہ مضمون بے شمار صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

”أَنْفِقِي، وَلَا تُحْصِي، فَيُحْصِيَ اللَّهُ عَلَيْكَ، وَلَا تُوعِي، فَيُوعِيَ اللَّهُ عَلَيْكَ“.

(رواہ البخاری، کتاب الہبۃ، باب ہبۃ المرأة لغير زوجها وعتقها: ۲۵۹۱)

”جمع جمع کرمت رکھو، خرچ کرو، گن گن کرمت رکھو، کہ اللہ بھی گن گن کر تمہیں دیں گے (گن گن کر خرچ کرو گے، تو اللہ بھی تمہیں گن گن کر دیں گے)“۔

”وَاللَّهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ“.

(رواہ مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل الاجتماع: ۲۶۹۹)

”اللہ اپنے بندہ کی مدد و نصرت میں مشغول رہتے ہیں جب تک وہ اپنے بھائی کی مدد و نصرت میں مشغول ہو“۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث کا معنی و مفہوم ان احادیث صحیحہ سے موید ہے؛ لہذا معنی کے اعتبار سے مضمون صحیح ہے۔

ابو عبد اللہ واقدی کہتے ہیں:

ایک مرتبہ میں بہت ہی تنگ دستی میں مبتلا ہو گیا، عید قریب تھی، میں یحییٰ بن خالد برکی کے ساتھ تھا، اُس وقت خادمہ حاضر ہوئی اور عرض کیا: عید کا دن قریب آچکا ہے، ہمارے پاس عید منانے کے لیے کچھ بھی سامان نہیں ہے، تو میں نے میرے ایک تاجر دوست کے پاس خط لکھ کر اپنی ضرورت بتائی اور قرض مانگا، انہوں نے ایک سربمہر تھیلی دی، جس میں بارہ سو درہم تھے، میں نے اُس تھیلی کو لیا اور اپنے گھر واپس آ گیا، گھر پہنچ کر تھوڑی

دیر بھی نہیں گزری تھی کہ میرا ایک ہاشمی دوست میرے پاس آیا، تنخواہ کی تاخیر اور اپنی ضرورت کا اظہار کیا، میں اپنی اہلیہ کے پاس گیا اور اُن کو پوری بات بتائی، اہلیہ نے کہا:

علیٰ ای شیء عزمتم؟

”کیا ارادہ کیا؟“

میں نے عرض کیا:

علیٰ ان أقاسمه الکیس،

”تھیلی میں موجود درہم دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ اُنہیں دیدوں“

اہلیہ نے کہا:

ما صنعت شيئاً، أتيت رجلاً سوقة، فأعطاك ألفاً ومأتي درهم، وجاءك رجل، له من رسول الله صَلَّى اللهُ عليه وسلم رحم ماسة تعطيه نصف ما أعطاك السوقة؟ ما هذ شيئاً، أعطه الکیس كله.

”تم نے کچھ نہیں کیا، بازار کے ایک عام آدمی نے تمہیں بارہ سو درہم دیے اور تم اُس کا آدھا دینے کا ارادہ کر رہے ہو؟ حالاں کہ تمہارے پاس ایک ایسا شخص آیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جس کی رشتہ داری ہے، ایک عام تاجر نے تمہیں جتنا دیا، اُس کا آدھا دے رہے ہو، درہم کی پوری تھیلی اُنہیں دے دو۔“

اہلیہ کے کہنے پر میں نے اُس ہاشمی دوست کو درہم والی سربمہر تھیلی سپرد کر دی۔

میرے اُس ہاشمی دوست کے ساتھ میرے تاجر دوست کی دوستی تھی، وہ دوست اُس ہاشمی کے پاس گیا اور قرض مانگا، ہاشمی نے بے چین وہ تھیلی اُس تاجر دوست کے حوالے کر دی، تاجر دوست نے اُس تھیلی اور اُس کی مہر کو پہچان لیا، پھر وہ تاجر دوست میرے پاس آیا اور واقعہ سنایا۔

اس کے بعد یحییٰ بن خالد کا قاصد میرے پاس آیا اور یحییٰ نے کہلا بھیجا کہ میں امیر المؤمنین کی خدمت میں لگا ہوا تھا، اس وجہ سے قاصد کو تمہارے پاس روانہ کرنے میں تاخیر ہوئی ہے۔ (لہذا تم میرے پاس آؤ)۔

چنانچہ میں سوار ہو کر یحییٰ بن خالد کی خدمت میں حاضر ہوا اور تھیلی والا واقعہ سنا کہ ایک تھیلی کس طرح تین افراد کے پاس سے ہوتے ہوئے دوبارہ بھیجنے والے کے پاس ہی آگئی، پھر یحییٰ بن خالد نے خادم (غلام) سے کہا: اے غلام! وہ دینار لے آؤ، خادم دس ہزار دینار لے آیا، یحییٰ بن خالد نے مجھ سے فرمایا: تم دو ہزار دینار لے

لو، دو ہزار دینار اپنے تاجر دوست کو دے دو، دو ہزار دینار اپنے ہاشمی دوست کو دے دو اور چار ہزار دینار (دوسروں کی بہ نسبت دو گنا ہدیہ) تمہاری اہلیہ کو دے دو؛ کیوں کہ وہ تم سب میں سب سے زیادہ سخی ہے۔ (رواہ ابن عساکر فی ترجمۃ محمد بن عمر واقد: ۶۸۵۰، تاریخ بغداد فی ترجمۃ محمد بن عمر بن واقد ابو عبد اللہ الواقدی: ۱۲۰۳)

عبرت و نصیحت:

ایثار و احسان کا بدلہ بہت جلد مل جاتا ہے؛ لہذا اپنوں اور پرائیوں کے ساتھ احسان و ایثار کا معاملہ کرنا چاہیے، مذکورہ واقعے میں تاجر دوست خود ضرورت مند تھا، اس کے باوجود اقدی کی ضرورت کو اہم سمجھ کر اُن کو قرض دیا، اقدی کے گھر میں تنگ دستی تھی، اس کے باوجود انہوں نے ہاشمی دوست کو وہ تھیلی اُن کی ضرورت کی وجہ سے دے دی، ہاشمی دوست نے تاجر دوست کی ضرورت کو اہم سمجھتے ہوئے وہ تھیلی اُن کے سپرد کر دی، سب نے ایک دوسرے کے ساتھ ایثار کا معاملہ کیا۔

لہذا دوستوں کو ایک دوسرے کا معاون، خیر خواہ اور ضرورت کے وقت تعاون کرنے والا بننا چاہیے، تنگی اور پریشانی کے موقع پر ہی مخلص اور غیر مخلص دوست کی پہچان ہوتی ہے۔

عورتوں کو دینی امور میں اپنے شوہر کا معاون و مددگار ہونا چاہیے، حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا:

لو علمنا أي المال خیر، فنتخذہ؟

”اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ کون سا مال افضل ہے، تو ہم اُس کو اختیار کریں؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”أفضله لسان ذاكر، وقلب شاکر، و زوجة مؤمنة تعينه على إيمانه“

(رواہ أحمد و الترمذی عن ثوبان فی سورة التوبة، رقم: ۳۰۹۴)

”بہترین مال: ذکر کرنے والی زبان، شکر کرنے والا دل اور نیک بیوی ہے، جو دینی امور میں شوہر کا

تعاون کرنے والی ہو۔“

شوہر دینی کاموں میں وقت اور مال خرچ کرنا چاہتا ہے، رشتہ دار اور مہمانوں کا اکرام کرنا چاہتا ہے، ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنا چاہتا ہے، تو ان تمام باتوں میں شوہر کا ساتھ دے اور ہر دینی کام میں شوہر کے شانہ بشانہ چلے؛ بلکہ دینی امور میں بیوی کو ایک قدم آگے رہنا چاہیے، کسی بھی اعتبار سے رکاوٹ نہ بنے؛ بلکہ شوہر کی معاون و مددگار بنے۔